

حالیہ سے معذرت کے ساتھ

مرتب
احمد جمال پاشا



مکتبہ میری لائبریری ۰ چوک اردو بازار ۰ لاہور ۲

غالب سے معذرت کے ساتھ

میری لائبریری

(۳۳۶)

اپنے شفق و مکرم ادب و ہر یہ کرم و
چند دھری لبشیر احمد صاحبِ خدمت
میں برائے اشاعتِ خصوصی
نیاز مند
اسلم پاشا

غالب

سے

معذرت کے ساتھ

مہرباناً

احمد جمال پاشا

مح

چیش لفظ

خدا آسمان، خیمہ قدور و برہ ملک شام جہاں
نواب اسد اللہ خان المتخلص بہ غالب ہوں
مہربان دوست غائب ہوں

مکتبہ میری لاہوری لاہور ۲

جلد حقون مضمون

ماشر چودھری بشیر احمد
مازید مکتبہ میری لائبریری لاہور
منظم اشاعت چودھری محمد شاہ نواز
مکاتبت ایم غلام مصطفیٰ فوشہ، لاہور
پرنٹر ناظم پرنٹرز لاہور
اشاعت ۱۹۸۸ء

معذرت

غالب سے معذرت کا سلسلہ نسیم انہونی صاحبہ کے فرمائشوں پر شروع ہوا اور انہیں کہہ فہمائشوں پر تمام ہوا، اب تائشوں تو نہیں مگر بنشائش کے آئندہ میں لے تائش کے لیے پیش کیا جا رہا ہے۔

اسے انتخاب نامہ کے بارے میں مجھے اپنی طرف سے یہ کہنا ہے کہ ج
یوں جھج کرتے ہیں بگر لنت لنت کر۔

..... احمد جمال پاشا

مزید معذرت

احمد جمال پاشا صاحب نے نسیم انہونی صاحبہ کی فہمائشوں پر سلسلہ انتخاب ختم کر دیا تھا میں نے اس میں مظفر علی سید صاحب کے انشائیے "غالب کے ناخنی" کا اضافہ تجویز کرنے کی کھسارت کی ہے۔

غالب اور پاشا صاحب سے معذرت

بشیر احمد جودھری

لاہور

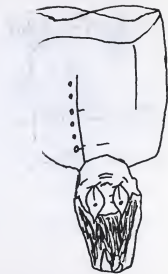
۱۸ جنوری ۱۹۸۸ء



ڈاکٹر اعجاز نقوی کے نام

یوں اجر می احباب کی محفل

کس سے پرچیں کون کہاں ہے ؟



غالب نما

۵	نثر	معذرت
۷	انتساب	
۱۳	پیش نقد	بنجم الدولہ و ہیر الملک اسد اللہ خاں غالب
۱۷	غالب کی روح اور مرچن کا فاختہ	سی۔ م۔ ا۔ اور دھونچ
۲۳	سوانح غالب	بہری چند اختر
۳۹	شعر غالب اور میاں فضلہ	م۔ م۔ ع۔ صدیقی، اور دھونچ
۴۲	موازنہ غالب اور میر	ثیا پروین
۴۹	غالب اور گونے	عاجی قتی
۵۶	غالب ہدیہ شعرا کی مجلس میں	کنیت لال کپور
۷۲	غالب اور مصرعے	شفیع عقیل
۷۸	غالب کے اشارے	خندان
۸۰	غالب اور شریک غالب	دجاہت، علی سندیلوی
۹۴	مرزا غالب کا غلط پنڈت نہ دے کے نام	فرقت کاکردوی
۹۹	مرزا غالب داسٹل میں	ضیاء الدین احمد شکیب
۱۰۲	دلی ناداں تجھے ہوا کیا ہے	فلک پیا
۱۰۴	غالب اور تیلن	حمیدہ سلطان
۱۰۷	غالب کے ناخن	منظر علی سید

۱۱۵	مرزا غائب پر قاتلہ حملہ	نامحرم راز
۱۲۰	برقی مدت کہ غائب مرگیا	صالحہ عابد حسین
۱۳۲	غائب داد مرشر کے سامنے	محمد الہدین غاروقی
۱۳۷	مرزا غائب سے انٹرویو	زمین کشادہ
۱۴۵	غائب کا ایک اور شعر	مکرم قوسوی
۱۴۹	خطرہ غائب	شوکت خانم
۱۶۰	کلام غائب کی شرح	اختر حسین
۱۶۵	غائب کی پیراؤں - غائب زمانے میں -	حائرم علی آزاد، ضی بی بی، حکیم آغا ہادی عیش
۱۶۶	پریٹکل مشورہ	اودھ پانچ
۱۴۹	چوبیسے	اودھ پانچ
۱۷۰	طرح غائب	عزیز کھنوی
۱۷۲	فرسودہ غائب	علامہ اقبال
۱۷۳	محبوب کی بڑ	دیگنہ چنگیزی
۱۷۵	غائب غائب	شوکت خانم
۱۷۹	ی۔ ایں۔ او	سید محمد جعفری
۱۸۰	میرزا غائب	محبوب لاہوری
۱۸۲	اپنا اپنا آقا	اکبر لاہوری
۱۸۳	مرحبا - جے	عاشق محمد خدی
۱۸۴	قاش کہیں جے	کرکھن
۱۸۵	غائب ایک مستعدان میں ایک اینگلو انڈین حسینہ کی ستر	راجہ صدیقی علیاں
۱۸۸	کاشیں	اے۔ ڈی انور

۱۹۰	قاضی غلام محمد	تھکدان
۱۹۲	کاوذب ماری	کاذب کا خط غائب کے نام
۱۹۳	شاد حدیثی	آدم اور غائب
۱۹۹	ہرفن	تربوز
۱۹۸	آزاد محبوبا	بوریا نہ بھا
۱۹۵	ذہیر قریشی	نذر غائب
۲۰۰	عبدالمطلب فریاد	نذر غائب
۲۰۳	عابد نظامی	غزل
۲۰۳	محمد افضل خاں	مرزا غائب سے مصدق کیساتھ
۲۰۵	اسرار بصری	اندرون خانہ
۲۰۶	ج - نج - شمس	سمن غائب شکن
۲۰۸	رسمانہ اصغری	گدھا کی ہے
۲۰۹	سید محمد جعفری	غائب اور انیس
۲۱۵	عظیم عباسی	برنگ غائب
۲۱۷	راہہ ممدی علی خاں	غائب باما شو کمپنی
۲۱۹	علی مرچکوٹہ	خامڑا ڈس
۲۲۱	اسرار بصری	ہیلی بوجھ پیلی
۲۲۳		غائب کا لہتر



پیش لفظ

ان
خلد آشیاں نجم الدولہ و سیر الملک نظام جنگ نواب
اسد اللہ خاں المتخلص بـ غائب طبری صاحب خلعتِ محنت پارچہ

مارٹالا یا تیری جواب طلبی نے، جنت میں نہ کاغذ ہے نہ لکٹ ہے۔ اچھے لغاتوں میں سے ایک بزرگ لفظ پڑا ہے۔ تمہاری کتاب کے مسودہ (غالب سے مسدودت کے ساتھ) میں سے ایک سادہ کاغذ چھپاؤ کہ تم کو پیش لفظ لکھتا ہوں اور بزرگ لغاتے میں مسودہ کے ساتھ ملغوت کر کے بھیجتا ہوں۔ نگلیں نہ ہونا۔

تمہاری طرانی، تحریر کا مختصر جواب فقط یہ ہے کہ اب تم ہی کو۔ میں تم کو کب لکھوں، اسے وہ اگلی صحبتیں اور تقریریں اب کہاں، سب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں، دنیا میں مڑوں کو دتا تھا یہاں زعموں کو دتا ہوں اور نیرنگی نہ مانہ کو دے دیتا ہوں۔

صاحب سُنو یہاں "یوم غائب" کے موقع پر سید اکبر حسین اکبر صاحب اور آبادی سہیل سیشن جی، ابوالمزاج سید مقبول حسین صاحب ظریف کھنوی، غائب شکر مرزا یا س دیگاز

پہچان، مردار مت الا جیب سابقین سیشن جی حیدر آباد، سزا عظیم بیگ چغتائی، ایڈووکیٹ جنرل جے پور، نگاہی اردو داسے قلمبندی، پروفیسر احمد شاہ بخاری پطرس پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور، ڈاکٹر کٹر جنرل براڈ کاسٹنگ ہندوستان، نور اسٹنٹ سیکرٹری جنرل اقوام متحدہ، ادب کیفیت داسے، حاجی آتی، غلام بہادر میاں عبدالعزیز ٹکاب پیما، ہری چند اختر، مولانا چراغ حسن حسرت، مولانا عبدالمجید ساکات، سعادت حسن منٹر، شوکت متاخری، امجد لاہوری، احسن علی خاں وغیرہ جمع ہو گئے تھے۔ اکبر الہ آبادی صدارت کر رہے تھے۔ فرحت اللہ بیگ شہر نشور بہا کیے ہوئے تھے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی ایم اے علیگ سابق صدر شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سید محمد جعفری، کرنل شفیق الرحمان، راجہ حمیدی علی خاں، پروفیسر کنہیا لال کپور، ابراہیم جلیس، فرحت لاکھڑوی، مشتاق احمد یوسفی، کوکین، کپتان سید ضحیر جعفری، غریب جیلپڑی اے ڈی اختر، شفیق حقیق، وجاہت علی سندھوی اور عبدالمجید سہاوی کو بھی دعوت نامے بھیجے گئے تھے مگر کسی بندہ خدا نے کھینکے کا نام بھی نہ لیا، خدا را ان سب کو جلد از جلد بھراؤ۔ شوکت کریاں لڑا سو کی سفارش سے بلایا ہے اب کلیجہ منہ کو آتا ہے ہائے یہ غضب کیا، اللہ بے صاف کرے۔

یوم غالب کے موقع پر سب بہشتی غائبے جمع ہوئے تھے۔ ہری چند اختر نے سوانح غالب، پڑھی مثنیٰ میں نے ان کی پیڑھ مٹھوٹی مٹھی۔ آہا! ”میاں فضلہ کی غالب والی پر“ ”مرووں کے فاتحہ“ نے جودہ لائق روشنی کر دیے تھے۔ ”فضلہ“ اب بھی ملتے ہیں۔ پان کھائے بٹنل میں پانمان دہائے، منہ سے جھاگ اڑائے، آج کل ان کی سیاسی سرگرمیاں شباب پر ہیں۔ نصیب دشمنان، احمدوں کی ٹیڈ یونین کے سیکرٹری بن بیٹھے ہیں۔ لو اب میاں سہاوی حسین کی سناہیک دن کیا دیکھتے ہیں کہ لاپتے کا پتہ منشی سہاوی حسین، رمضان کے سربراہ و پچ کی مشکل خالی رکھوائے چلے آ رہے ہیں، آتے ہی خال کھوا،

دی، دیکھا تریں؟ پر لٹکل مشاعرہ تھا۔ میرا اور اپنا قاشا بنایا تھا۔ میں نے دعا میں دیں
 تو بڑے۔ دعاؤں سے نہ دنیا میں کام چلا نہ بہشت میں چلنے کی قریح ہے۔ آپ کی
 دعائیں تاثیر رکھتیں تو پیش زہاری جو ہالی، بڑے دن بھلے نہ جوہا تھے۔ چندے کا مایہ
 تھا۔ ”ادود پنج“ پھر سے نکالنے کے لیے بھنڈتھے۔ میرے نام چندے کی رسید کاٹ
 گئے۔ منگری نہ سوچا کہ ہے

چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں

یہاں کی بڑی چھو، مولانا غائب علیہ الرحمۃ ان دنوں بہت خوش ہیں۔ سپاس ساٹر
 جزو کی کتاب دیوان غائب مرتبہ فردوس شمشاد علی راسپوری اور اس سے کسی قدر کم حجم کی دیوان
 دیوان غائب مرتبہ منت جگرم ہانک رام دانتہ آگئی ہے۔ ریفری جریٹر میں ادو ناب اور
 شراب طور موجود ہے۔ دن بھر کتاب دیکھا کرتے ہیں رات بھر شراب پیا کرتے ہیں۔
 اشادانتہ تم تو بڑی جبارت آرائیاں کرنے لگے۔ مزاحیہ نظم و نثر میں خود غائیاں
 کرنے لگے میاں یہ کون دستور تم نے نکالا۔ ساری کتاب خود گھٹی صفت میں غائب پر
 تہمت دھری اگر پیش لفظ بھی خود لکھ لیئے تو کون تمہارا کیا بگاڑ دیتا اگر شانت کریتا تو
 ثروت کہاں سے لاتا اور ثروت مل جاتا تو مساد کو آگے کیسے بڑھاتا، کیسی صداقت کہاں کے
 عواد اور پیشی، یہاں کچھ کلام و پیام ممکن نہیں۔

تم کیا کہتے ہو، نظم و نثر کے جو مسودات و تحریفات تم نے جمع کر دیئے ہیں اور کارٹون
 پر کارٹون چسپاں کر دیئے ہیں۔ واللہ باللہ یہ سب کے سب اس سے پہلے میرا نثر
 سے بھی نہیں گزرے تھے۔ ان کو دیکھ کر یا دگار غائب۔ دے مولانا حالی بخلیج پہناتے
 لگے اور بڑے ”اسی دن کے لیے میں نے آپ کو ایمان غریب“ لکھا تھا۔ ”خلیفہ عبدالملکیم اور
 مولانا عبدالرحمان بجنوری جیسے غائبوں کی بھی حق و گنگ ہے۔ اتنا ان کے بھی شمار میں
 نہ تھا۔ میری اور تم اس کتاب کو کھنڈر میں چھپواؤ، کھنڈر کے چھاپے خانے نے جس کی

کتاب بھائی س کراسان پر چڑھا دیا۔ جس کو خدا سے الفاظ کو چکا دیا اور یہ بات جتنی
 کا ہے کہ معلوم ہوگی کہ یہاں نزل کشور نے ایک لیٹنر کا پرلےں یہاں سے آتا ہوا ہے۔
 حضرت سہمان اللہ! میری تحریفات اور پیران پر پیش لفظ بھی کیا ہے، یہاں سے آتا ہے
 پر تحریر ہو، چوہیاں جو قنداری مرضی، اگر کسی منظر ہے تو اس کھکے کو مہر پر پیش منظر ہاؤ
 اور یقین ہاؤ کہ حرف حرف اور لفظ لفظ جو کچھ ہے وہ میرا ہے اور جو میرا ہے وہ تیرا ہے کیا
 قندارے کھکے پر پیش لفظ ہے۔

یہ صاحب کا عادی حسین سلیمان اگر انہی خواجہ حالی کی فراسی ہیں اور قندار بیان درست ہے
 قوان کو بھی یہاں جلدی ہونے کا انتظام کرو، جیسے ان کی فراسی ویسی میری فراسی، اس
 زمانے میں ان کو حد نبڑانے کا اہتمام بھی ممکن ہے۔ آج کل رضاں سے صلح ہے۔ ہر حال
 یہاں رہ کر ٹیڈی گرل ہونے سے حور بنا کہیں بہتر ہے۔ جبکہ یہی وہ یہاں کے وہ خود قدیم و
 جدید ہیں۔ ان سے کوئی حد طویل ہے جی ہنگام نہ کریں حوصلہ سے کام لیں، میٹروں کے
 لیے میں جبرئیل سلمہ کو بھیج دوں گا۔

میاں دہا بہت ملی سندھو بنی کو دعا پہنچے ان سے کہو اگر ہر کے تو کٹر قندار احسن
 ہاشمی کے باغ سے دھڑوں کی ایک ذالی لانا نہ سمجھ لیں۔

تم سے کب انکار ہے۔ اللہ اللہ! تم اردو کے مزاج انکار اور صفائی بن گئے، کہو
 وہاں کے لوگ تم کو ٹیڈی گرل کہنے لگے یا نہیں۔ منشی سہار حسین کا سلام تم تک پہنچے قنداری
 سعادت مند ہیں کا کٹر احوال بنا کر تھے ہیں۔

سید وزیر الحسن صاحبی، منظور علی سید، ڈاکٹر وحید قریشی، ارشد میر اور ناشرین کے
 خاندان سے کہ چودھری نذیر احمد اور چودھری بشیر احمد کو سلام کہنا، اور انکے چھوٹے بھائی
 منیف راے سے جو میری تصویریں بنائی ہیں عبدالرحمن چشتی اور صادقین سلیمان سے بیعت
 سے گئے ہیں، آخر بادشاہ میر سے دل کے ٹکڑے کنہیا لال کپور کو دعا کہنا اور بان یاد کیا
 دو اللہ! بھائی — اور جہاں نے بھی مجھے یاد کیا ہے چودھری محمد شاہ نواز کے ساتھ ان کو بھی سلام

غالب کی روح اور مرچوں کا فاتحہ

ایں جانب رحمت اللہ علیہ ضمیر غالب کا خیال نہ کیجئے گا کہ دوبار قیامت آثار میں اس روزگارِ شفا شمار نے خاصانِ ادب گلشنِ ”سبھا“ کی بنائی ہوئی قلم روز ایک کتاب پرش کی ہے۔ کتاب اکٹھا ۲۴ صفحات کی ہے جو بحساب ”ابھد“ ”تعب“ ”یعنی ہمارا شاعری کے غصے ہمدرد اور سخت کردار کاوش کی بناوٹ ہے۔ گلشنی دید و زیب، چھپائی لا ریب، ٹائٹل نظر فریب، لیکن معنی دسا اور ریب“ ”ہیں شہروں کے نمونہ کے لیے صرف ایک مضمون کافی ہے جو ہر ذیاد۔“

تکافیر ”بن“ ”روایت“ میں ”ہلا کر دیکھئے کیا ہوا۔“

تین

(۱)

ہرئی ہے لڑنِ فراق تماشا خانہ دیرانی کعبہ سیلابِ باقی ہے جنگِ نبردِ دلنہی

مطلب

غالب کہتا ہے کہ۔

غالب دیرانی اس صورت میں بالغ ذوق تماشہ بر گئی ہے کہ "کعبہ سیلاب" روزفل میں
 "ہنر" بھی گیا ہے جس کی وجہ سے نظر باہر نہیں جاسکتی حالانکہ "سیلاب" سے جو دیرانی ہوتی
 ہے وہ درود و پاد کے محاب کی بھی تاب نہیں لاسکتی لیکن میرے گھر کی "دیرانی" نئے
 شکل کی ہے "سیلاب" کا ذکر جس طرح اس شعر میں آگیا ہے وہی طبیعت اور شعر کا
 اصلی "وصاف" ہے۔

لیکن "سعدی" کا مطلب یہ ہے۔

میں اس قدر رویا کو میرے آنسوؤں کے سیلاب نے میرے گھر کو تباہ کر دیا۔ اور اب
 روزفل میں کعبہ سیلاب رونے کی طرح موجود ہے۔ جس سے لذت تماشہ کبیر بھی باقی نہیں
 معلوم نہیں یہ سیلاب جذبیہ اشک باری کیونکر اور کس نقطہ سے آگیا۔ اس کے بعد
 اس "رونے" کو دیکھتے۔ ج

مطلب تو کہ نہیں ہے فقط طغیانی طغیانی ہے

غالب تارن اور رونے میں نہایت نفی و منفی پیدا کر اور یہ نئی صنعت ایسا کر کے
 غالب غریب کی مدح کو گڑبٹا دیا ہے۔

متن

(۲)

مخالف نیک ہوں یا بد ہوں پر صفت مخالف ہے
 جو گل ہوں تو ہوں گلشن میں جو خس ہو تو ہوں گلشن میں
 غالب نے اس شعر میں "وضع الہی علی غیر محلہ" کی تصویر دکھا کر اس منہم کو ثابت کر دیا
 ہے اور اس کے علاوہ اس کی ترتیب میں ایک صنعت بھی ہے۔

منشایہ ہے کہ "تہائی اور بھلائی" مرقع کے لٹاؤ سے ہوتی ہے فلسفہ کا ایک سُر
 ہے کہ کوئی چہ باذات نرئی اور صلی نہیں ہوتی بلکہ مرقع کے لٹاؤ سے ہوتی ہے۔ اس کی شکل

یہ ہے کہ "خس" اور "گل" اگر اپنی اپنی جگہ پر رہیں "گلشن" اور "گلش" میں ہوں تو ان کا وجود
 ہستی اور معنوں ہے۔ لیکن اس کے برعکس نامناسب اور غیر معنوں ہے۔ "سناٹوں چک
 ہوں یا بڑہوں" کا "شکر"۔ اس مطلب کو واضح کرتا ہے۔
 مطلب سعدی۔

میں تو یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں اچھا ہوں..... الم اگر میں گل ہوں تو اس صفت کو
 جو حاصل ہے یہی گلشن کہتا ہوں دونوں کا فرق عیاں ہے۔
 آگے چل کر فرماتے ہیں۔
 "گلشن و گلش" کے ایسے ہی مصنفین مختلف طریقوں سے مصنف نے کئی جگہ لکھے
 ہیں جو گزرتے ہیں۔

ہیمن "انہیں خصوصیات کے ساتھ" جو ترجمے تو اس کی سمجھ کا تصور ہے۔
 مصنف سے دونوں مراد ہو سکتے ہیں مثلاً "بھی اور" مانتی "بھی۔" انھیں

مستن

(۳)

ہزاروں دل دیے جو شہ جنوں عشق نے جو کو
 یہ ہو کر سوید ہو گیا ہر قطرہ خون تن میں

مطلب

"جوش جنوں" جو عشق کے سبب سے ہے "مارہ سوداوی" بن کر قطرہ خون
 میں جم گیا ہے، دل بھی چونکہ خون ریز کی شکل میں ہے۔ اس لیے ایک عاشق شیدا
 تمام جے جوئے قطرات خون کو دل سے قہر کرے گا مطلب یہ ہے کہ میں سزا پانے

”جہنم جی گیا ہوں۔“ سید ”اور سو دیا“ میں مناسبت بھی موجود ہے۔
 ”رنگ سوداوی“ کیسا ہوتا ہے؟ کسی حکیم سے پوچھنا تھا۔ ”جوش جہنم“۔
 ”کارنگ جہان“ غائب کی قوت تخیل و ایما کا اعجاز ہے۔
 مطلب سعدی..... سودائے جہنم کی وہ ذیادتی ہر دل..... گریا مجھے
 نیکڑوں دل مل گئے..... جس قدر میرے جسم میں خون کے قطرے ہیں۔ وہ سب
 دل میں اور ہر دل میں سودائے جہنم بھرا ہے اور ہر دل میں مستحق کی یاد ہے۔ یہ
 سمجھ کی بنیاد پر ہی فرمایا ہے۔
 ”یہ شعر بیت الغزل ہے۔“
 اسی بنیاد پر اگر یہ بیت الغزل ہے تو شاعری کا گہرا بھرا ہوا۔

تین

(۴)

مڑے جہان کے اپنے نظر میں سنک نہیں
 سوائے خون جگر، سو جگر میں سنک نہیں

مطلب

دنیا کے اندر میری نظروں میں ”خون جگر“ کے سوا اور کوئی چیز باقی نہیں تھی اور کسی
 چیز میں لطف و متاع اس کی کچھ وقعت تھی ذکرِ نظر سے ثابت لیکن اب وہ بھی نہیں بچا۔
 چیز پر دنیا کو منحصر اور مخصوص کر کے اس کی نفی کی ہے۔
 دنیا کی نفی ہو گئی، غائب کا یہ فلسفہ ہے کہ ان کی فہرست یا کتاب ”حزانِ نعمت“
 اور ”ایمانِ نعمت“ کا کوئی جھگڑا نہیں۔

مطلب سگانیا کے انواع و اقسام کے کمانوں میں ہیں کچھ لذت نہیں آتی سوائے غم و غبار کے بہت بہت بقول "شارح" صاحب "غائب" محبوب کار ہوا ہوگا یہ شعر کہہ کر اُس نے کسی سے کہا نا مانگا ہے "حسن طالب" اس کا نام لفظ "مزنے" کی وجہ سے انواع و اقسام کے کمانے منگائے گئے ہیں۔

متن

(۵)

یہ کس بہشت شائق کی آمد آمد ہے
کو غیر جلوہ گل رہگذر میں خاک نہیں

غائب کہتا ہے کہ بہشت کے ایسی خولہ رکھنے والا کون محبوب آ رہا ہے جس کے قدم کی برکت یہ ہے کہ راستے میں خاک کی جگہ پھول ہی پھول نظر آتے ہیں۔ حالانکہ راستے میں خاک ہوا کرتی ہے لیکن آنے والا چونکہ بہشت شائق ہے اور بہشت میں آقا نازے نہایت ہر اصول پر ہوا سامان خوشی کے اور دوسری چیز نہیں اس لیے "خاک" گل بن گئی۔

یہ "خاک" اصلی معنی میں گل کھلا رہی ہے اس کی سُن اس طرح چلید کی گئی ہے کہ یہ کون بہشت شائق آج سیر باغ کے لیے آتا ہے کہ سما چہرہ کے رہگذر میں اور کچھ نہ نہیں آتا غائب کے مطلب میں ایک چٹ کا اضافہ کیا گیا ہے کہ غریب باغ میں بیٹھا ہے تب مستحق اس کی طرف آ رہا ہے۔ صرف ایک "گل" نے اتنے "سے" باغ مجسم غائب دونوں کو اپنی طرف کھینچنا ہے درجہ "سیر باغ" کا مفہوم کہیں سے نہیں نکلا۔ "خاک نہیں" "کچھ نہیں" کے معنی میں زیادہ دل نشیں ہے یا اسی ضمن میں اس کا نیسو مذاق پر منحصر ہے۔

مثنیٰ

(۶)

بعد اسے نہ بھی کچھ مجھی کو جسم آتا
اثر میرے نفس بے اثر میں خاک نہیں

غالب نے اپنے غیر معمول اور مخصوص انداز سے خاص بات پیدا کی ہے کہتا ہے کہ
اگر میرے نفس (اکہ) میں اثر ہوتا ہے تو مجرب کہ نہ بھی کم سے کم مجھ کو تو اپنی جان پر دم
آتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میری آہ یا نفس میں اثر کا وجود نہیں۔ وجود ہوتا تو کسی کو
محسوس ہوتا عدم محسوس پر دلالت کرتا ہے۔

مطلب سعدی۔ اگر اسے میرے اور عدم نہ آتا تھا تو کچھ مجھی کو اپنے حال پر ترس آتا کہ
اس کے عشق سے باز آتا اور اس گریہ و زاری سے احتراش آتا۔

عشق سے باز آنے کی بھی ایک ہول ہے۔ معلوم نہیں اس کے بعد پھر کیا اور رہ جاتا؟ یہ
سب اسی "دشتِ نفس" کے پھل پھل ہیں۔

پوری "شرح" اس قسم کے خصوصیات سے "بہرور" ہے۔ "عجب سے کھٹنہ
کے ایسے مردم خیز خط سے ایسی شرح کیسے پیدا ہو گئی؟

ابنِ جانب کے خیال میں حضرت عزتِ عزیزِ جناب، "ماتقہ جناب" مشرقی اس "شاعری
افزین" شرح کے مشفق پیدا بند و بست کتاب ہے "درد" پرانی شاعری۔ اپنا بڑا بستر
اٹھا کر دھچک رہ جائے گی۔

راقم۔

ہمارے شعر میں اب صرف دل لگی ہے اسد

کھٹا کہ فائدہ عرصہ میں ہنس میں خاک نہیں

کس۔ م۔ ۱۔ کھٹری

مطبعہ اودھ پریس ۱۹۶۴ء

سوانح غالب

مزاح

”تحقید عالیہ“ کا دور دورہ ہے اور تحقیق و تدقیق کی سنگلاخ زمین میں نئے نئے پھول اور پودے اُگا کر دیرانے کو گلزار بنانے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ اس ضمن میں مصنفوں اور شاعروں کے سوانح حیات اُن کے کلام اور تصانیف سے مرتب کرنے کا شغل عام ہو چکا ہے۔ بعض لوگوں کے خیال میں یہ مسئلہ میں سے خطر نکالنے کی کوشش کے مترادف ہے۔ لیکن کھنے والوں نے کتا بھی کھو ڈالیں، اور ہم ابھی انہیں رائے کے گنبد سے باہر نہیں آچکے۔

یارانِ تیز گام نے محل کو حب یا

ہم عجزِ ناکہ برس کارواں رہے

بس خاکِ از قوۃ کلاں بردار بدل کرتے رہے مرزا غالب پر قلم صاف کرتا ہوں۔

ان کے سوانح حیات بعض حضرات بڑی تحقیق و تفتیش کے بعد کتابی صورت میں پیش کر چکے ہیں، پھر بھی میرا خیال ہے کہ ان سطور میں جو کچھ مختصراً پیش کیا جا رہا ہے اُسے پڑھنے کے بعد آپ مصنف کو دعائے مغفرت سے یاد فرمائیں گے۔

غالب کے حالات

نام۔ مرزا کا نام تمام تذکرہ نویسوں نے اسد اللہ خاں لکھا ہے چونکہ آپ

ایران افسل تھے، اس لیے اسد اللہ اور خاں کے درمیان بیگم کا لفظ بھی بڑھا دیا جاتا ہے، لیکن نئے محققوں نے اس نام کے مسئلے کو بھی خاص تحقیقات کا مستحق سمجھا، اور بڑی کاوش و تلاش کے بعد ثابت کر دکھایا ہے کہ غائب کا نام احمد شاہ بیلک یا اندزے تنگ نہیں، بلکہ اسد اللہ خاں تھا۔ ان کے اس انکشاف کی تائید مرزا کے دو شعروں سے ہوتی ہے۔

امان دانے نے اسد اللہ خاں تمہیں

وہ دلوے کہاں وہ جوانی کہ صرغمی

اسد اللہ خاں تمام ہوا

لے دینا وہ زعفران ہوا

مرزا کا تخلص کئی غزلوں میں استہ ہے اور اکثر میں غائب۔ اس سے پتہ چلے کہ وہ ان کو شک ہو چلا تھا کہ مرزا کا دیوان دو مختلف شاعروں کے کلام کا مجموعہ ہے لیکن ہمارے نئے تذکرہ نویسوں نے بزدور قلم ثابت کر دیا ہے کہ غائب اور اسد اللہ اصل ایک شخص کے دو تخلص ہیں۔ البتہ ان تذکرہ نگاروں کا یہ خیال درست نہیں کہ مرزا اپنے اسد تھے۔ پھر غائب بن گئے، حقیقت یہ ہے کہ مرزا نے آخر تک اسد تخلص ترک نہیں کیا، بلکہ مرنے کے بعد بھی سب سے پہلے شعرا اسی تخلص سے کافر ملتے ہیں

یہ لاش بے کفن استرخستہ حبس کی ہے

حق مغفرت کہے عجب آزاد مرد تھا

پیدائش

نام اسد تخلص کا مسدویں مل ہو گیا، لیکن مرزا کے کئی پیدائش اور عمر کے بارے میں نئے انداز پرانے تمام تذکرہ نویسوں نے بڑی طرح سوچیں کھائی ہیں۔ سب نے

غالب کا سنی پیدائش ۱۲۱۲ء تکھا ہے، اور عمر ۳۰ سال، لیکن یہ صرف تخمینہ ہے۔ مرزا خود کہتے ہیں ہے

فنا تعلیم درسی بخودی ہوں اس زمانے سے
کہ مجنوں کا لام الف گفت تھا دیوار و بیتاں ہر

اس سے ظاہر ہے کہ مرزا نہ صرف قیس عامری کے زمانے میں زندہ تھے بلکہ عمر میں بھی اس سے بڑے تھے۔ کیونکہ جن دونوں قیسی ایک ہندی چوکرے کی حیثیت میں مکتب کی دیواروں پر لام الف گفتا چھڑا تھا، اس وقت مرزا صاحب بخودی کے پروفیسر مقرر ہو چکے تھے۔

مجنوں کے زمانے میں مرزا کی موجودگی کان کے ایک اور شعر سے بھی ثابت ملتا ہے۔

عاشق ہوں پر مستحق فریبی ہے مرزا کام
مجنوں کو بڑا کہتی ہے۔ یلنا مرے آگے

اس دونوں شعروں کو ملا کر پڑھیں، قویہ ثابت ہو جاتا ہے کہ مرزا غالب قیس عامری سے بہت زیادہ خوب صورت تھے۔ پہلا شعر بتاتا ہے، کہ آپ مجنوں سے عمری بہت بڑے تھے لیکن دوسرا شعر کہہ رہا ہے کہ یلنا جو مجنوں کی بلوہ ہوئے کے علاوہ خود بھی اس پر فریضہ تھی۔ جب مرزا غالب کے سامنے آئی تو زوجہ ان مجنوں کو بہت حقیر سمجھنے لگی اور اس حقارت کا کھیلے لفظوں میں اظہار کر دیتی تھی۔ مرزا نے اگرچہ اسے اپنی مستحق فریبی کا کثرہ ظاہر کرنا چاہا۔ لیکن یہ ان کی کسر نفسی ہے، مگر مرزا، مجنوں کے مقابلے میں سچ پچ پرست نہ ہونے تو یلنا پر ان کی مستحق فریبی بھی کارگر نہ ہو سکتی۔

والدین

غالب کے باپ کا نام قاسم تذکرہ میں عبد اللہ بیگ درج ہے لیکن مرزا کے کلام سے اس پر کچھ بھی روشنی نہیں پڑتی۔ تاہم مرزا کے باپ کا کچھ نہ کچھ نام ضرور کچھ نہ کچھ نام ہیج سے ثابت ہے کہ اب سے کئی سو سال پہلے بھی ہندوستان میں باپوں کے نام ہوا کرتے تھے۔ مثلاً جہانگیر کے والد کا نام جلال الدین اکبر تھا اور شاہیوں کے باپ کاغیر الدین بابر بادشاہ، اس تاریخی انکشاف کے بعد اگر قاضی کی رعایت سے اسٹو کے باپ کا نام عبد اللہ تسلیم کر لیا جائے، تو میرے خیال میں کوئی قباحت نہیں۔

مرزا کی والدہ ماجدہ کا نام کسی کو معلوم نہ ہو سکا۔ لیکن انہوں نے اپنے ایک خط میں شکایت کی ہے کہ ایک شخص نے ان کو بڑے بے ایمانی کی گالی دی۔ اس سے ثابت ہوا کہ غالب کی کم سے کم ایک ماں ضرور تھی۔

تعلیم

معلوم نہیں مرزا نے تعلیم کہاں پائی۔ مجنوں کے زمانے میں کوئی باقاعدہ اسکول اور کالج تو تھا نہیں، صرف ایک دبستان تھا، جس کی دیواریں مجنوں نے لائم الٹ کھد کر کر سیاہ کر ڈالی تھیں۔ اس لیے کسی اور کے دہاں کچھ لکھنے کی گنجائش ہی نہ رہی مجنوں سے پہلے شاید غالب نے بھی یہاں کچھ دن گزارے ہوں لیکن ظن غالب یہی ہے کہ مرزا انگریز ہی پڑھتے تھے۔ بہر حال یہ ظاہر ہے کہ وہ جاہل نہیں تھے، اگر ناخامدہ ہوتے تو شکر کی جھکو کھڑے، اور اس کی تصانیف کہاں سے آجاتیں! شمس الملک مولوی محمد آقا نے بھی صرف بہادر شاہ ظفر کے استاد کو ذوق کی تصنیف بتایا ہے۔ غالب کے بارے میں اس شخص ظن کا انداز نہیں کیا۔

غائب نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہے ہیں۔ پس دونوں زبانیں
 جانتے تھے۔ البتہ اپنی ایک کتاب کا نام ”حمود ہندی“ رکھنے سے ظاہر ہے کہ خود اردو
 تصنیف میں وہ اردو کو ہندی ٹھہا کرتے تھے۔ چنانچہ مروج شہری کے وقت انہوں نے
 اپنی ماوری زبان ہندی لکھوائی تھی۔

پیشہ اور شغل

مرزا کاسب سے بڑا اور مستقل پیشہ تو عاشقی تھا، جس کا ثبوت ان کے دیوانوں
 میں جا بجا ملتا ہے۔ دوسرا شغل یہ تھا کہ شہر چڑی کر دسوا ہوتے رہتے تھے، خود جانتے
 ہیں کہ۔ ج

شہروں کا انتخاب نے دسوا کیا ملے

اس کے علاوہ بعض اور اشتغال بھی تھے، مثلاً انہوں نے مصوری بھی سیکھی تھی
 فرماتے ہیں۔

سیکھے ہیں مریضوں کے لیے ہم مصوری

تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے

پھر موت، یہ شیوہ رہا کہ صبح سویرے ضروریات سے فارغ ہوتے ہی کان پر تو دمکہ
 کر نفل کھڑے ہوتے اور سارا سارا دن بلا مسادہ دنگوں کے غلطو کہتے سپہرا کرتے
 لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ کسی سوشل سرورس بیگ کے ممبر بن گئے تھے۔ مقصد
 یہ تھا کہ

مگر کھوٹے کوئی ان کو خط تو ہم سے کھوٹے

ہرئی صبح اور گھر سے کان پر دمکہ کرتے نکلے

مختصر حالات

اب مرزا کے مختصر ساخ حیات سنئے۔ بہزب طوالت صرف چند واقعات کے بیان پر اکتفا کروں گا۔ جو نام معقود اور تذکرہ نویسوں کی نظروں سے اوجھل رہے۔ مرزا کی زندگی اگرچہ حسرت میں گزرتی تھی۔ لیکن اس کے لیے اللہ میاں فرما رہے تھے، خود مرزا اگر اقرار ہے کہ خدا نے قرآن میں دونوں جہان دے دیے تھے۔

دونوں جہان دے کے دو گھر یہ خوش رہا
 یں آ پڑی بہ شرم کہ تھوڑا کب کریں
 سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ پھر دونوں جہاں گئے کہاں؟ جواب مرزا کے اس شعر میں موجود ہے۔

وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ نام ہے
 یہ جانتا اگر تو ٹٹا نہ گھر کو نہیں
 پس دونوں جہاں بھی گھر کے ساتھ ہی نٹا دیے ہوں گے۔
 غالب کا گھر نہ صرف دیران تھا بلکہ اس میں دیرانی سی دیرانی تھی۔ چنانچہ ہے
 کم نہیں وہ بھی عزائی میں یہ دست معلوم
 دشت میں ہے مجھے وہ میٹھ کہ گھرا یہ نہیں

عادات اور خصائص

مرزا بڑے سادہ لوح اور صفات دل نسان تھے، اکثر ایسی حرکتیں کر بیٹھتے ہیں کا قبو ان کے جن میں بہت بُرا ہوتا۔ چنانچہ ایک دفعہ مہذب کی گلی پر بیٹھے بیٹھے فراموشی

غلغلے باعث ہاسبان سے چند یا گنجی کراں - کہتے ہیں ہے
 کداسمیر کے وہ چپ تھا مری جو شامت گئے
 اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے ہاسبان کے لیے
 ایک مرتبہ خود محبوب کے ہاتھوں بھی پڑے - لیکن قصور اپنا تھا - اس لیے
 نہایت ایماندار می سے اعتراف بھی کر لیا کہ ہے
 وصل دھپا اس سر پانڈ کا شیوہ نہیں
 ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن
 اس سادہ لوحی کی بدولت ایک دن محبوب کی حد سے زیادہ تعریف کر کے
 ایک عزم خوار راز داں کو رقیب بنایا - ثبوت ملاحظہ ہو
 ذکر اس پر می دش کا اور پھر جیسا اپنا
 بن گیا رقیب آخر تھا جو راز داں اپنا
 لیکن دیوانہ بکار طیش ہر شیر ، کبھی کبھی رقیب کو ٹیل بھی دے جاتے
 ے تاکہ سے نہ غناؤی کر یا ہے دشمن کو
 دوست کی شکایت میں ہم نے ہم نہ بلایا
 مرزا نجوم اور جوتش کے نہ صرف قائل تھے - بلکہ محبت کے مسائل میں بھی
 جوتشیوں سے پوچھ چکے کرتے رہتے تھے اسی لیے کہا ہے
 دیکھئے پاتے ہیں حشاق جنوں سے کیا فیض
 ایک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

غالب کا دل

۔۔۔ غالب کا دل عام لوگوں کی طرح خونِ صمد و انرشت کا مستحضر نہ تھا

بکراؤنت کا ایک بڑا ٹکڑا تھا اور مرزا اس کی گوداگی کے ہمیشہ شاکر رہتے تھے
اور شکر ہوتا ہے۔

میں اور ایک آفت کا ٹکڑا وہ دل وحشی کہ ہے
عاقبت کا دشمن اور گوداگی کا آشنا۔

لیکن خدا نے فضل کیا اور مرزا کو جلد ہی اس سے رہائی مل گئی ایک دن
بیٹے بیٹے سوزنشاں کا دورہ ہوا اور مائے کا سارا دل بے محابا جل گیا۔ اس حادثہ
خارجہ کا ذکر مرزا نے یوں کیا ہے۔

دل مرا سوز نہیں سے بے محابا جل گیا
ہوش خاموش کی بات نہ گویا سبب گیا

بد قسمتی سے مرزا کے ناخن بہت جلد جلد بڑھتے تھے۔ چنانچہ زخم ابھی جھکنے
بھی نہ پایا تھا کہ ناخنوں کے کھڑپے پھر تیز ہو جاتے ہیں۔ فرماتے ہیں :
دوست غم خداری میں میری سہی فرمائیں گے کیا
زخم کے بڑھنے تک ناخن نہ بڑھائیں گے کیا

غالب کا زمانہ

غالب کے زمانے میں دلی میں غم آفت کا قحط پڑ گیا تھا۔ فرماتے ہیں :
ہے اب اس مسمومہ میں قحط غم آفت آسہ
ہم نے یہ مانا کہ دلی میں نہ ہے کھائیں گے کیا !

افسوس کہ سارے دلیان میں کہیں وضاحت نہیں کی گئی کہ غم آفت بادشاہ
کے دربار خانے میں موجود تھا یا وہاں بھی جھانڈ پھر گئی تھی۔ نیز یہ کہ راشن کی دکانیں
پر کس مہاد بکتا تھا۔

البتہ یہ صاف ظاہر ہے کہ مرزا کی خوراک غمِ نعلنت ان کی خوراک کا جزوِ اعظم تھا۔
لیکن اس قحطِ سالی میں بعض چیزوں کی ارزانی بھی تھی۔ مثلاً دل اور دھان بازار
میں بکا کرتے تھے اور ہر شخص جب اور جتنے چاہے خرید سکتا تھا۔ مرزا کا احترام ہے
ہے تم شہر میں جو تو رہیں کیا غم اٹھیں گے
لے آئیں گے بازار سے جا کر دل وہاں اور

غالب کے زمانے میں پورے سات آسمان تھے۔ آج کل ڈو آسمان بنائے چائے
ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ باقی دو آسمان ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزی حملہ میں ناپائیدار
ہو کر گئے۔ مرزا کے زمانے کے ساتوں آسمان ایک ٹکڑے بھی سکون و قیام
کی لذت سے آشنا نہ ہوتے۔ بلکہ رات دن لگاتار گھومتے رہتے تھے۔ مرزا کہتے
ہیں ہے

سات دن گردش میں ہیں سات آسمان

پورے گا کچھ نہ کچھ گھبرا نہیں کب

اس زمانے کی ایک عجیب و غریب خصوصیت یہ تھی کہ اگر کسی محبوب کا نہ
معلوم نہ ہو سکے تو اس کی پیدائش کھل جاتی تھی۔ ایک مرتبہ مرزا پر بھی یہ گزر گئی۔
احترام فرماتے ہیں ہے

دہن اس کا جو نہ معلوم ہوا

کھل گئی پیدائش میری

سب سے بڑی قہامت اس حملہ کی یہ تھی کہ مجرموں کو سخت و خبیثہ سزائیں
دی جاتی تھیں۔ چنانچہ مرزا غالب ایسے شخص کو بھی ایک مرتبہ کسی جرم کی پاداش
میں پھڑے میں بند کر دیا لیکن زمانہ اس قدر عذاب تھا کہ مرزا اس صورتِ حال کو
بھی غنیمت سمجھتے تھے ہے

نے تیر کہاں ہیں ہے نہ صیاد کہیں ہیں
گوشے میں قفص کے لمبے آرام بہت ہے

غالب کا محبوب

مرزا محبوب ہیں الا قرامی شہرت کا نامک متا اس کا نام سامے جہان کو معلوم
متا۔ لیکن کبھی کسی شہر اور کسی متانے میں کوئی شخص اس کا نام سہم گر کے بغیر نہ دیتا
متا۔ مرزا کہتے ہیں ہے

کام اس سے اکڑا ہے کہ جس کا جہان میں
یوے نہ کوئی نام سہم گر کے بغیر
اس محبوب کے عادات و خصائص بھی عجیب تھے نہ مثلاً گایاں بہت دیتا تھا
مرزا بچتے ہیں ہے

ہاں گیا بھی نہیں قرآن کی گایوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرف درباں ہو گئیں
اسی طرح اگر مرزا کبھی شکوہ شکایت کریں تو وہ فرما اٹھو بھاگتا اور بیچاراں سے
بارہ ہند و راؤ نکم مرزا کے جتنے رقیب تھے سب کو جمع کریتا۔ مرزا جھنجھٹ کے کہتے
ہیں ہے

جمع کرتے ہو کہیں قریبوں کو

اک تماشہ بھاگلو سنہ ہوا

جب کبھی وہ رقیب کی بٹل میں سوتا تو مرزا کے خواب میں اگر چہاں تہمت کیا
کتا۔ اسی لیے کہا ہے

بٹل میں غیر کی آپ آج بکے ہیں کہیں درند

سبب کیا خواب میں اگر جسم ہائے پند کا
 یہ مستحقِ محنت، کرسی، مونڈھے یا چارپائی پر بیٹھا پسند نہ کرتا تھا۔ ہمیشہ بیٹے
 پر بیٹھا، اور اگر بوجہ نزلے تو کھڑے کھڑے چل دیتا۔ مرزا دور رہے ہیں کہ
 ہے جگر گرم ان کے آنے کی
 آج ہی گھر میں بوجہ پند ہوا
 یوں بھی وہ اچھا نیا صاحبِ حق تھا۔ عشق و محبت کے پیدھے سادے صحاحات
 بھی نہ سمجھ سکتا تھا مرزا شاکی ہیں کہ
 ان کے دیکھے سے جو کھاتی ہے منہ پڑوئی
 وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے
 آخر میں وہ بے طب بوسے بھی دینے لگا تھا۔ مرزا کی دگانی مہری شہادت
 حاضر ہے۔

صحبت میں غیر کی نہ پڑنی ہو کہیں یہ غر
 دینے لگا ہے ہوسہ بنیرِ اقب کیے
 مستحق کی صحت اچھی نہ تھی۔ اکثر رشتہ و غیرہ کا شاکی رہتا تھا۔ ایک دن بڑی
 مفتوں کے بعد مرزا کے قتل پر دھنسی ہوا۔ لاک شمشیر سے وہ چار کچے دینے کے بعد
 کاری دھم لگانے کے لیے دستہ اٹھایا تھا کہ خراج گرا اور مسجد چنگا دستہ تھرپاکی ناگہب بن
 کے لگنے لگا۔ مرزا کی رنج و غم کے مارے چنچ لکل گئی ہے
 ہاتھ ہی تیغ آدھا کا کام سے حب ناما رہا
 دل چاک لگنے نہ پایا زخم کاری ہائے ہائے
 اس کے مذہب کے متعلق صرف یہ ہتہ چتا ہے کہ غیر مسلم تھا جسے تو کہا
 ہے

دل دیا جان کے کیوں اس کو دغا دار است
 غلطی کی کہ جو کافر کو مسلمان سمجھا
 ہیں اہل قرامی شہرت کے باوجود بے چارے کا گھر گھاٹ کہیں نہ تھا ایک نیچے ہی
 دھکی کے دن کاٹ رہا تھا۔ مرزا فرماتے ہیں ہے
 کہاں بھگ رموؤں اس کے غمے کے پیچھے تیار تھے
 مری قسمت میں یا رب کیا نہ تھی دیوار پتھر کی !
 لیکن بعض اشعار میں سنگِ دریاہاں ۔ دیوارِ دیو کی موجودگی کا قرینہ پایا جاتا
 ہے۔ ممکن ہے بعد میں اسے کوئی مکان ملا کر دیا گیا ہو۔

چند متفرق واقعات

ایک مرقہ مرزا نے اڑنے کی کوشش کی لیکن جوانِ جہازِ دیو سے کام نہیں یا
 کسی اور طریق سے اڑے جس کا نسخہ اور ترکیب استعمالِ دیو و سیدہ سیدہ اُن تک پہنچ
 کر اُن کے ساتھ ہی دفن ہو گئے۔ بہر حال اڑے تو سہی لیکن جھٹ جال میں پھنس
 کے پھر پھڑپھڑانے لگے۔ اسی حال میں گھٹتے ہیں ہم

پنہاں تھا دامِ سخت قریب آشیانے کے
 اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

اس شعر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مرزا نے کچھ مدت گھونسلے میں بھی گزاری۔
 مرزا کا ایک مدبان بھی تھا جب مرزا کا گھر دیران ہو گیا۔ تو اس کے لیے کوئی کام نہ رہا
 مگر اس نے مرزا کا ساتھ نہ چھوڑا اور گھاس کھو دو گز راتفاق کرتا رہا۔ مرزا فرماتے ہیں
 اگاہ ہے گھر میں ہر سو سبز و دیران تھا شکر
 مارا ب کھو دے پر گھاس کے ہے جیسے مدبان کا

غائب نے کئی مرتبہ بہشت کی سیر بھی کی ایک مرتبہ وہاں سے واپس آئے
 تو محبوب سے کہنے لگے ۔

کلم نہیں جلوہ گری میں قرے کوچ سے بہشت
 یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں
 خواجہ خضر سے بھی مرزا کی اکثر ملاقاتیں ہوئیں ۔ نصیرت الملک کے قصیدے
 میں ارشاد ہوتا ہے ۔

تو سکندر ہے ، مرا خضر ہے طشت تیرا ،
 گو مشرف خضر کی بھی لمحہ کو ملاقات کا ہے

لیکن دوسرے مصرع میں مشرف کا لفظ دوستانہ مروت کے بارے استعمال
 کیا ہے ۔ ورنہ دراصل وہ خضر کو رہنمائی کے قابل نہ سمجھتے تھے ۔ ثبوت حاضر ہے
 لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
 مانا کہ اک بزرگ ہیں ہم سفر لے

مرزا بزدل بھی بہت تھے ۔ ایک مرتبہ مسرک پر راہزن کا سامنا ہو گیا تو مرزا
 بزدل بھی بہت تھے ۔ ایک مرتبہ مسرک پر راہزن کا سامنا ہو گیا تو اسے دیکھتے ہی
 دم دبا کر بھاگ نکلے ۔ لیکن دورِ دصوب کے باوجود پچڑے لگے ۔ اب ستم ظریف
 لکھنؤ مارنے لڑا نٹ کر کہا — ” کم بہت ہیں اس قدر دوڑایا ہے ، لے اب ذرا پاؤں
 داب “ اس واقعہ کو یوں نظم کیا ہے ۔

بھاگے تھے ہم بہت سوائسی کی سزا علی
 ہو کر اسیر داجتے ہیں راہزن کے پاؤں

مرزا اپنے رقیب کے دروازے پر ایک کم نہ ایک زیادہ پورے ہزار مرتبہ
 گئے ۔ شعرے معلوم ہوتا ہے کہ محبوب بھی اتنی ہی مرتبہ وہاں گیا ہے

ہاں پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
اے کاش جانتا نہ تری رہ گزر کو میں

کچھ مدت مرزا کی حسرت نے یہ شدت اختیار کر رکھی کہ بے جا سے دلی کی
نگہوں میں بالکل تنگ و محروم چہرتے رہے ایک دن اسی حالت میں بادشاہ
کے دربار میں پہنچے اور بہادر شاہ ظفر سے شکوہ کیا ہے
آپ کا بندہ اور پھر سے ننگا

آپ کا ذکر اور کھائے اُدھار

اس پر بادشاہ کے آپ کو ایک بہت بڑا کرتا سلوا دیا۔ جس کا دامن اتنا
بڑا تھا کہ اس کا ایک سر اُدھونے میں ہی چور اور یا خشک ہو گیا۔ اس پر
ارشاد ہوا ہے

دیرائے معاصی تنگ آئی سے ہوا خشک

میرا سر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا صحت

نوٹ ۱۔ اس زمانے میں دیرائے جن کا نام معاصی تھا اور مرزا وہیں کپڑے
دھونے ہلایا کرتے تھے۔

ب۔ دیرائے ننگا کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ سودگ لوگ میں بہت تھا
اور سری رام چندر جی کے ایک بزرگ ہمارا جو مہاگیر متہ تہیتا کے زور سے اے
زمین پر لائے تھے۔ اب دیرائے جن کے ظہور کا حال مرزا جی سے سُن لیجئے کہتے
ہیں کہ میری وحشت کے لیے عرصہ آفاق بھی تنگ ہو گیا تو زمین کو بڑی مشرم آئی
حق اگر اُس کی پیشانی پر بڑے زور کا پسینہ آگیا بس وہی دیرا بن گیا ہے

وحشت پر میری عرصہ آفاق تنگ ہے

دیرا زمین کو مرق انفعال ہے

مرزا کا محبوب کہیں کعبہ کے گرد و فراخ میں سکونت پذیر تھا۔ چنانچہ
 کہیں مرزا کو دریا پر ڈائٹ ڈپٹ ہوئی تو وہ کعبہ کی جانب چل دیتے کہا ہے
 اپنا نہیں یہ شیعہ کو آرام سے بیٹھیں

اس درد چ نہیں بار تو کعبہ ہی کو ہو گئے

اس طرح آئے دن محبوب کے گھر اور کعبۃ الہیہ کے آگے سے ثابت ہوتا ہے کہ
 اس دماغ میں کعبہ دہلی سے بہت قریب تھا۔ بعد میں گرمی کی شدت سے وہیں پھسل
 گئی تو دہلی اور مکے کا درمیانی فاصلہ بھی بڑھ گیا یا پھر مرزا کو کوئی بہت تیز رفتار سوار لگا
 مل گئی ہوگی۔

مرزا نے مرنے کے بعد بہت سے شعر کہے اور کسی نہ کسی طرح اپنے شاگردوں
 کو بھی پہنچائے۔ انہوں نے دیوان میں شامل کر دیے ج
 ”حسن غزلے کی کشاکش سے چٹا میرے بعد“

یہ ساری غزل مرنے کے بعد لکھی گئی۔ اسی قبیل کے دو شعر اور عام مرزا ہیں۔

اللہ سے فوق وشت فردوسی کو بعد مرگ

پہلے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پاؤں

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمس یاد

مجد سے مرے گنہ کا حساب لے خدا نہ مانگ

جنوں عمر میں تو مرزا سے چھٹا تھا ہی۔ اس کا انتقال بھی ان سے پہلے ہوا۔
 مرزا کہتے ہیں۔

ہر اک مکان کہ ہے کہیں سے شرف اسد

جنوں جو مر گیا ہے تو جنگل آؤ اس سے

مرزا بے ہاد سے کی موت بھی غریب الوطن میں ہوئی۔ فراتے ہیں۔

شعر غالب اور میاں فضلہ

خدا غریب رحمت کرے وہ زمانہ بھی عجب مزے کا زمانہ مستاجب ہر حال کے کتب
میں ایک نیا سرمذائے شہنشاہ سے اور نیا پانچواں پہنچے، تہی دستہ میں بے مقدمین کی نغمہ
نغمہ کی کمال اور حیران کن تھی۔ روکا پڑھتا تھا۔

لے زبردست زبردست آزار

گرم تاک کے بماند ایس بازار

حق ترجمہ پڑھتا تھا

لے خبر ذات خبر ذات کے ٹوکھ دویا

تھی کب تاہیں رہے یہ تیری بھڑیا

اور بسا اوقات اسی پڑھنے پڑھانے میں ایسے ایسے دقیق مسائل مختلف صوم کے

صل ہو جاتے تھے کہ اصل مصنف کو نہ سوجھتے تھے ہائے وہ تو نہ ہے، نہ وہ کتب

آپ تو بچو کیسوں۔ اور۔ فر۔ معنی نہیں ایس۔ اور۔ سو۔ معنی ایسا کی آواز آتی ہے

... مامتیں کو سے دلدارم "کی صدا ہی بند ہو گئی۔ وگ۔ یہ تسلیم کرنے کے لیے آمادہ

ہی نہیں کہ اگلے شعر کا معشوق حقیقی خدا ہوا کرتا تھا اور سارے جہان ہی غمزدہ ہو کر

حقیقت کے سرخروپ دیے جاتے تھے۔ شعر کا نفس عادت کامل کی طرح مختلف

کی خیمہ سے چوتھیا نظر بیداری، کے سر پہلے طے کرتا تو یہ یعنی خدا کی جانب سے منہ
پھیرنے کے بعد پھر اسی طرف پھر تاشادات پر لالت مار کے متعلق فتا۔ ترک دنیا
پیراوی (سوائے محبوب کے) اختیار کر کے زندہ کاشتوت دیتا، مکتوبات کا بوجھ اٹھانے کے
جنگشوں کی فہرست میں نام لکھواتا، شکوے کے ترک سے صبر کی خندق کھواتا،
جہانے محبوب پر چٹھانے سے صبر کے رضا کا طالب ہوتا محبوب پر بھر دہ کر کے توکل
کا جامہ پہنتا اور اس طرح ایک عالم کا مرشد ٹھہرتا تھا۔ آج کی پڑوسی گھسی بیڈیاں تو
منہیں مگر پڑائی عزتیں روٹیاں میں پانی بھر کے چھتے ڈالتی ہیں اور کوئی شہر پڑیہ کے
کہتی ہیں۔ یا خواجہ حافظ شیرازی عاشقوں کے ہوشیار معشوقوں کے قاضی شاعر
نبات کی قسم میری خال سج ہی سچا نکلی۔

شہرائے حال میں گرل بالکل ایسا نہ نکلا جو حادث کامل سمجھا جائے مگر خدا
رکھے ہمارے سیدن پر کے میاں فضل کو انہوں نے زمانہ حال کے شاعروں میں
غالب علیہ الرحمۃ کو انتخاب فرمایا اور ان کے اردو کلام کی فارسی میں شرح لکھ ڈالی۔
خدا عزوجل رحمت کرے غالب کو اگر آج زندہ ہوتے تو اس شرح کو سنتے ہی
شہر گرائی سے توبہ کر لیتے، یا پھر ایسے ہی اشار کی بھر مار کرتے جن میں پائے عاؤس کا
قلم اور ان کا ہاتھ ہوتا اور لم ٹنگے اشار مستحق بہر قدم کے کفر کی طرح آخوش رقیب ہی
چھد کتے پھرتے۔ چوں چوں کہ حضرت از رشادات کلک گھر سلک طبع نقاد و مہار
سندانی عندیہ شیریں زباں شاخہ مسالی اسحق افضل الفضلہ و اکمل الکملہ مروسی
سید فضل حسین صاحب عزت میاں فضل مستور علی قصبہ سیدن پیر و باب تشریح مسانی
است۔

غالب

نقش ناز بہت ملاز باغوشش رقیب

موازنہ غالب و میر

..... دہلی ویسے پہلی مجلسوں میں یہ بحث عام طور پر سنی جاتی ہے کہ غالب بڑا استاد
میر بھی بڑا استاد تھا یا میر بڑا استاد اور غالب اس کے مقابل ٹھکانا تھا۔ یہ بحث اور اس
بحث کی افادیت تو بعد میں زیر بحث آئے گی سب سے پہلے تو یہ دعوٰی کرنا ہے کہ ایسی
بحثیں کرنے والے خود ان دونوں عظیم الجثہ فنکاروں کے مقابلے میں منور نہ ٹھکنگے ہیں۔
اسی قسم کی ایک مجلس میں ایک صاحب نے گرجتے ہوئے کہا کہ ”غالب عظیم تھا“
پھر زور سے سینہ بھایا اور بولے ”غالب ملّی کل غالب“۔ ایسا لگتا تھا کہ مرزا اسد اللہ
خان غالب المستخلص بہ مرزا خوشہ کی بات نہیں ہو رہی ہے بلکہ کسی درلڑ چیمپئن
قسم کے ذریعہ اسٹائل کشتی لڑنے والے کسی غالب پہلوان کا ذکر کر رہے ہیں۔ ان صاحب
کا جوش و خروش ابھی سرد نہ ہونے پایا تھا کہ ایک عدد میر نے اُن دھکے اور لاؤڈا سپیکر
انما میں بولے ”میاں صاحبزادے! آپ کو معلوم بھی ہے کہ خود غالب نے میر صاحب
کی عظمت کا کلام کیا ہے۔ وہ کیا شعر ہے۔“

”سنئے ہیں اگلے زمانہ میں کوئی میر بھی تھا۔“

_____ غالب پرست تنگ بولے ”اے اداں! سنئے ہیں کہ تھا کوئی میر بھی تھا اس
سے عظمت کا پتلا تانبہ وغیرہ ماننے کی بات کہاں نکلتی ہے؟“۔ میر نے دماغ

پہ زور دیتے ہوئے چہرہ گویا ہوئے۔ اور اس کے بارے میں کیا خیال ہے کہ آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں۔ "مطلوب صاحب نے نہایت لطیفانہ سے جھگایا نہ انداز میں پان چہاتے ہوئے کہا۔ ہاں!۔ بقول ناتجہ کی بات تھی اور یہ غالب کی سعادت مندی اور مشرافت تھی ورنہ کہاں غالب اور کہاں میر۔ یہ بحث شاید بعد دس پانچ دلائل وغیرہ اور بڑھتی لیکن وہ تو خیر گزری کہ ایک صاحب مرزا یا تسی یگانہ چیز می کے پرستاروں میں سے آئے تھے اور چھپتے ہی انہوں نے یگانہ کو غالب و میر دونوں کو انیس کے مقابلے میں چوبیس قرار دے دیا اور میر تھے اور مطلب دونوں کو فرداً مشترکہ دفاع کی پالیسی وضع کر کے ان پر چڑھ دوڑنا پڑا۔

یہ بحثیں تقریباً پانچ صدی سے جاری ہیں اور مزید سو صدیوں تک ان کے جاری رہنے کا قلعی خطرہ موجود ہے، بشرطیکہ یہ دنیا بذات خود اتنا حوصلہ جاری نہ کئے میں کامیاب ہو جائے۔ ایک صاحب تھے، نام ان کا شیخ ابراہیم ذوق تھا اور استادش شخص فرمایا کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی ایک مار و مار سے بھر لیا غزل میں جھولے سے یہ شعر کہ دیا تھا کہ ہے

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب

ذوق و یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

اب یارانِ لکھتے داں (یا لکھتے چیں) کا عالم یہ ہے کہ اس شعر کو بھروسہ لے لے جب دیکھے بحث میں مصروف ہیں۔ مطالعہ سے تو اس طرح مبالغہ گتے ہیں جیسے سیاسی لیڈر انسان پسندی سے اور کام حوامی مطالبات سے، لیکن بحث کرنے میں نہیں گئے تو قسم کھا کر کہ غالب اور میر میں سے کوئی بڑا ثابت ہو یا نہ ہو، وہ مزور بننے ثابت ہو کر ہیں گئے۔ اب ان عقل مندوں سے کوئی پوچھے کہ بھی اگر تم نے ہاں پر کیل

کر ان میں سے کسی کو بڑا ثابت کر بھی دیا تو کیا تمہیں جمہوریت یا بنیادی حقوق مل جائیں گے؟ اور اگر تم کسی کو بڑا ثابت کرنے میں ناکام بھی ہو گئے تو کیا تمہیں کوئی سیٹھٹی ایجنٹ میں پکڑائے گا؟ لیکن صاحب! یہ بات پوچھتے ہوئے بھی ڈرنا پڑتا ہے کیونکہ یہ حضرت آذدیچتھے ہیں نہ تاؤ، چھوٹتے ہی سوال پوچھنے والے کو بدذوق قرار دیتے ہیں اور بے چارہ سوال کرنے والا خود ایک سوالیہ نشان بنکر رہ جاتا ہے۔ اگر میرے خلاف خود اس دور میں موجود ہوتے تو اپنے ان طرفداروں کی عنایات پر سر جڑ کر دوتے اور پھر ایک دوسرے کے مقابل بیٹھ کر لڑتے ہوٹلوں سے سراج الدین نظر کا یہ مصرع باری باری پڑھتے اور پھر دوتے جہ دماغ ہوش و گفتگو نہیں رکھتا

.... ~ ~ ~

برکین یہ موضوع ہے واقعی توجہ طلب۔ میرا مطلب ہے کہ اس قسم کی کھڑول کا ختم اندیس ضروری ہے۔ اسی ضرورت کے پیش نظر میں نے بڑی قوس، ہائفلٹائی اور محنت وغیرہ وغیرہ کے تحقیق کی اور مدتوں بعد یہ بات سامنے آئی مگر تومیر صاحب غالب سے بڑے تھے اور نہ غالب تومیر صاحب سے۔ اس کے برعکس وہ دونوں ہی بڑے تھے اور دونوں میں اس امر پر کلی اتفاق و اتحاد پایا جاتا تھا۔ وہ تو بڑا ہو کہ اس زمانہ میں "مشترکہ اعلانیہ" کا رواج نہ تھا اور ہوتا بھی کیسے اس وقت سیاسی حالات اتنے بدتر نہ تھے، ورنہ آج کے اس غیر یقینی دور میں یہ فضول بحثیں جہنم نہ بنتیں۔

میری بات یقیناً کچھ لوگوں کے لیے چونکا دینے والی ہوگی۔ لیکن دعوئے بے دلیل کرنا میرے مسلک کے خلاف ہے۔ کوئی بھی غیر ذمہ دارانہ بات کہ میرے لیے سخت مضحکہ خیز ہے (باقی رہی یہ بات کہ اگر غالب و میر پر بحث

کرنے والے حضرات بحث ترک کر دیں تو یہ ان کی صحت کے لئے بہت مفید ہوا
 ہاں تو بات حتمی تحقیق اور حاصل تحقیق کی تو اس سلسلہ میں اب تک جو بات
 پایہ ثبوت کو پہنچی ہے، وہ یہ ہے کہ ان دونوں بزرگوں میں بڑا اتحاد و اتفاق پایا جاتا تھا
 اس کے ثبوت کے طور پر ذیل میں چند ایسے اشعار پیش کیے جاتے ہیں جو تیسر و غالب
 نے مشترکہ طور پر کہے تھے اور کاتبوں کی غلطی سے الگ الگ دیوانوں میں چھپ
 گئے تھے۔

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
 پھرتے ہیں تیسر غرار کوئی پوچھتا نہیں

اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی
 یہ جانا اگر تو سنا نہ گھر کو میں

پوچھتے ہیں وہ کہ غائب کون ہے
 آگے آگے دیکھئے بہتا ہے کب

تر ہوا سب دہ محراب مبارک ہو
 قصہ شور و فساد ہے ہم کو

کہتے ہو اتحاد ہے ہم کو
 جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو

شیخ جبریں کی حسد مت میں
گایاں کھا کے بے مزہ سندھ جہا



مندرجہ ذیل اشعار کو جدید اصطلاح میں میر و غالب کے "مشترکہ اعلیٰ" سے
بھی مشہور کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ ان کا ہنرمندانہ بہت سے ناقد حضرات کچھ بے
عبرت آئینہ ہو گا۔ لیکن غیر جانب داری اور ذوق صحیح مشروط ہے۔ اس کے علاوہ شائقین
ادب کے تفتیشی طبع کے لیے غالب کے کچھ ایسے اشعار بھی پیش کیے جاسکتے ہیں جو عام
مردمان میں غلط چھپ گئے ہیں۔ بعض محققین کی رائے یہ بھی ہے کہ خود غالب ہی
ہے "کلیں دلیں ملیں" جو گئی تھیں جن کا غیاز وہ ادب پرستوں کو اب تک جھگٹتا
پڑا ہے۔ اب یہ اشعار نہایت طور و حسن کے بعد اصطلاح و تصحیح کے ساتھ ذیل
میں درج کیے جاتے ہیں۔

دل سے تری نگاہ مہر تک اتر گئی
حیراں ہوں دل کو روئی کہ پیش جگر کوئی



کچھ تو پڑھے کہ لوگ کہتے ہیں
شوق حد سے زیادہ ہے ہم کو



عجب کو دیارِ غیر میں مارا دلیں سے دور
اتنے سے قدر پر تم بھی قیامتِ شریر



کہیں گردشِ مدام سے گھبرانے چلے دل

افتادِ قرحہ مجھ سے مراد دستگیر ہو

~

قاش کو لے کر آئینہ داری !
تو کب تک سرے سر کو دھونا رہیگا !

~

ہر گمان ہے جس سے تیس سے آہ !
میں کہاں اور یہ وہاں کہاں

~

ہو کلن بادشاہ، کرنِ یاں و وزیر ہو
طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ

~

سر سچوڑنا، وہ، غائبِ شہیدہ حال کا
قم جی تو میر صاحبِ قندِ فقیر ہو !

~

میں اور جاؤں درد سے ترے ہر صدا کیے !
آخر گناہگار ہوں، کافر نہیں ہوں میں

~

یا الہی یہ ماجرا کب ہے ؟
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی !

~

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو ؟

شرم کو مگر نہیں آتی

تیش بنیر مرزا کا کوہن اسد
حق منفرت کو سے جب آزاد مرد تھا

ہے خبر گرم ان کے آسنے کی
میں کہاں ، اور یہ دہال کہاں !

سر پہوڑ تائیں غائب شہزیدہ حال کا
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

اُردو ادب میں تحقیق — بلکہ تفتیش کا یہ راستہ بے خطر مزدور ہے لیکن ہے دقت
طلب اور صبر کا زما۔ اس لیے میں اس انداز سے ریسرچ کرنے کا کوئی مشورہ کسی
کو نہیں دینا چاہتی بلکہ اگر کچھ سنت جاناں ادب یہ کام کرنے کے لیے میدان میں اُتر
آئیں تو بہت سے استادانہ کے ”خود روکھاں“ کے جھگڑے نئے ہمیشہ کے لیے ختم ہو
سکتے ہیں۔

شریہ پری

♦ ~ ~ ~ ~ ~ ♦

غالب اور گھوٹے

مجھ سے روایت کیا کامرٹھ باری علیگ نے اور انہوں نے سنا اپنے دوست مرزا کاظم سے اور مرزا کاظم نے سنا لی آپ بیٹی اور آپ مجھ سے سنیے۔ ”مرزا بیٹی“ میرے لانا وہیں اور اس کا ثواب پہنچائیے غالب اور گھوٹے کی امداد کو اور دعا کیجئے نیز حق میں اور اللہ عالم بالصواب !

مرزا کاظم جن دنوں برلن میں تھے ان ایام کا ذکر ہے کہ مرزا صاحب کی ملاقات ایک پنجابی سکھ پیرچرنگھ سے ہوئی اور دونوں تین چار روز تک ایک قہوہ خانے میں ایک دوسرے سے ملتے رہے ایک روز سردار جی نے مرزا صاحب سے کہا بھائی صاحب! بات یہ ہے کہ میں انکی جانا چاہتا ہوں اور میرے پاس کوئی پیسہ نہیں انکی میں میرا مستقبل بہت شاندار ہو سکتا ہے اس لیے اگر آپ کچھ روپیہ بطور قرض دلا دیں تو میں یہ قرض جلد واپس کر دوں گا۔

مرزا کاظم نے ایک لکھ سو چنے کے بعد کہا ”قرض؟ سردار صاحب یہاں پر دیں میں کن ایسا جندوستانی نارسخ اہل ہو سکتا ہے جو اپنے اعلیٰ عقول کے علاوہ کسی دست کو قرض دے سکے؟“

سردار جی :- مجھے کرن زیادہ روپیہ نہیں چاہیے.....

مرزا صاحب :- رات کاٹ کر اچھی کم زیادہ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا بات یہ کہ کسی سے ایسی درخواست کرنا ہی بے معنی چیز ہے ۔

سردار جی :- رات کو کسی کے لیے میں تو صبر کیا کیا جانے ۔

مرزا صاحب :- کیا کیا جانے ؟ بہت کچھ ہو سکتا ہے ۔

سردار جی :- روپا نہیں لگا ہوں سے دیکھتے ہوئے دو کی ۔ دو کی ؟

مرزا صاحب :- دو یہ کہ چند روپا نہیں کے بجائے ہر منوں کے روپے حاصل کیا جائے

جو بہت آسان کام ہے ۔

سردار جی :- وہ کیسے ؟

مرزا صاحب :- میں بالکل جانوں گا آپ کل اسی وقت قشرینٹ لے آئیے ۔

سردار جی کا کہنا سن کر خفا و کراہت انہیں اور آپ مرزا صاحب کا بوجھل شکر یہ ادا کر کے رخصت ہوئے ۔

رات بھر سردار جی کو نیند نہ آئی ، اولاد مرزا سے دن وقت مقررہ آئے آدھ گھنٹہ پہلے ہی قہر خانے میں پہنچ گئے اور بے صبری کے ساتھ مرزا کا نام کا انتظار کرنے لگے ، مرزا آئے اور قہر کی پیالی پیچے بہتے یوں گریا ہوئے ۔

مرزا صاحب :- دیکھئے سردار جی مرزا غالب ہندوستان کے بہت بڑے شاعر تھے ۔ آپ جانتے ہی ہوں گے ۔

سردار جی :- وہی نا جنس انڈین ٹیکسیر کہتے ہیں ؟

مرزا صاحب :- ہو سکتے ہوئے ، انہیں ٹیکسیر انڈین ٹیکسیر تو آغا کا شیری تھے جو شہر ڈرامہ نویس تھے ۔ غالب ان سے پہلے حمد علیہ میں گذرے ہیں ۔ آپ کا نام اسدا اللہ تھا تھا اور وطن وہی آپ فارسی اور اردو دونوں زبانوں کے بہت بڑے شاعر تھے لیکن عمر تلک دہستی میں گذری ۔ آپ کو شراب نوشی کا بہت شوق تھا اس لیے کبھی تلک ابدال

نصیب نہ پہنچا۔

سردار می۔ بالکل میرے چار ہزار نام لکھ کر طرح زلیدار تھا۔ دوسری زمین مٹی منجھ
جبریں عزت مٹی لیکن شراب نے پڑا غرق کر دیا آج اسے کوئی ہوس روپے فوہار
نہیں دیتا۔

مرزا صاحب۔ ہاں ہاں میں غائب کی بھی یہی حالت تھی لیکن میرا بڑا چھادار مرگ
لیکن امر کے سامنے نہ جھکا، اس کی ایک غریب یہ تھی کہ سردار می تو سر ہلاتے
جاتے تھے لیکن وہی نہ ہوتے جاتے کہ بات جو سنیں سے روپیہ حاصل کرنے کی تھی یہ مرزا
صاحب غائب کا قصہ کہیں چھیڑ بیٹھے آپ کہہ سنا ہی جاتے تھے کہ مرزا کا غم نے
ان کے دل کی بات کو جانپ کر ہاتھ سے اشارہ کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ خاموشی سے
ٹہنٹے جائیے۔

مرزا صاحب۔ غائب ایک فلاسفر شاعر تھے اور انہوں نے وہی فرمانہ پایا جو
جرمنی کے فلاسفر شاعر گئے کو نصیب ہوا گئے بھی مرزا صاحب یہاں تک
کہہ پائے تھے کہ سردار می سے صبر نہ ہو سکا اور انہوں نے بات کاٹ کر اپنی بات
شرع کدی۔

سردار می۔ لیکن مرزا صاحب جہنم میں جائیں غائب اور گئے آپ نے تو وعدہ
کیا تھا کہ آپ جرمنوں سے روپیہ حاصل کرنے کی ترکیب بتائیں گے۔

مرزا صاحب۔ بالکل درست اور میں وہی ترکیب تو بتا رہا ہوں آپ ذرا سہتے
جلد کیے آپ ہندوستان کے بہت بڑے مترجم شاعر اور ادیب ہیں۔

سردار می۔ میں اور شاعر۔

مرزا صاحب۔ ہاں آپ چپ و چپ اور میری بات سنئے آپ انوار کے دیں۔

ہو میرا دل۔ میں ایک تقریر کریں گے جس میں آپ غائب اور گئے کی شاعری کا سراغ

نہ نہیں گئے۔

سردار جی ۱۔ یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ میں تو جرمن زبان کا ایک لفظ بھی نہیں جانتا اور نہ غالب اور گرنے کی شاعری سے واقف ہوں۔

مرزا صاحب ۲۔ آپ اردو زبان میں اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو پنجابی زبان میں تقریر فرمائیے بات صرف یہ ہے کہ بولتے جائیے غالب اور گرنے کی شاعری سے آپ واقف نہیں تو ان کے نام تو چنداں مشکل نہیں فرمائیے تو۔

سردار جی ۱۔ غالب گرنے — غالب گرنے۔

مرزا صاحب ۲۔ بالکل ٹھیک آپ پاس ہو گئے صرف اتنی بات ہے کہ غالب اند گرنے کیے انگریزی زبان میں جسے ہم اینڈ کہتے ہیں۔ جرمن میں اسے اند گرنہ کہتے ہیں۔

سردار جی ۱۔ غالب اند گرنے — غالب اند گرنے۔

مرزا صاحب ۱۔ واہ وا خوب! اب آپ ہندوستان کے بہت بڑے رسالہ جی کل برلن کے اخبارات میں اعلان شائع ہو گا کہ ہندوستان کے مشہور رسالہ سردار پرچم سنگھ اتوار کے دن ہفت شام ہو مہرگ ہال میں غالب اور گرنے کے موضوع پر ایک زبردست تقریر کریں گے۔ واغڈ ٹکٹ کے ذریعہ ہو گا۔

سردار جی ۱۔ یقین تقریر میں کسوں گا کیا؟

مرزا صاحب ۱۔ جی جی میں گئے کہتے جائیے۔ پس بولتے جائیے اور ہر تہی مجھوں کے بعد غالب اند گرنے " کہتے رہیے۔

اتوار کی شام آہستہ ہو مہرگ ہال جرمن اہل ذوق سے کچھ کچھ جبرجی صدارت کی کرسی پر برلن کے ایک مشہور ماہر ادبیات جبرہ لغزہ تھے ان کے ایک طرف سردار پرچم سنگھ اور دوسری طرف مرزا کاظم بیٹے تھے۔ تقریر کا وقت آگیا اور سردار صاحب

تقریر کے لیے آئے۔ صاحب صدر نے اور حاضرین سے پروفیسر پرچم سنگھ کا تعارف کرایا۔ جس پر دل خیر مقدم کی تائیدوں سے گرجن اٹھا۔ سر دار صاحب نے اپنی تقریر شروع کی۔

صحابان مرزا اسد اللہ خاں غالب دہلی کے رہنے والے تھے اُردو واد فارسی دونوں زبانوں کے شاعر تھے شراب بہت پیتے تھے اس لیے ان کی عمر تلکدہتی میں میں گزری۔ دہلی ہندوستان کا دارالسلطنت ہے وہاں ایک گھنٹہ گھر بھی ہے پانڈی چمک میں سودا بیچنے والوں کی صدائیں بہت پیاری ہوتی ہیں۔ ہر طرف سے آوازیں آتی ہیں۔ غالب اندگڑٹے۔

مجھے نے پُر زور تائیاں بجا کر آسمان سر پر اٹھایا۔ اور جب تائیدوں کی گرجن ختم ہوئی تو سر دار صاحب نے تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا۔

دہلی سے تین سو میل کے فاصلے پر لاہور ہے میں ضلع لاہور کا رہنے والا ہوں۔ ہمارا علاقہ بڑا زرخیز ہے۔ پچھلے سال بارشیں کم ہوئی تھیں اس لیے فصلیں اچھی نہ ہوئیں۔ اس سال گودھ مارا ج کی کڑپا ہے نہر میں بھی پانی خوب ملتا اور بارشیں بھی اچھی برکتیں امید ہے کہ گیہوں کی فصل اچھی رہے گی۔ لاہور کی بہت سی چیزیں دیکھنے کے لائق ہیں مثلاً بادشاہی مسجد ماراجہ رنجیت سنگھ کی سادھ چڑیا گھر۔ غالب اندگڑٹے۔

پھر تائیدوں سے فضا گرجن اٹھی اور صاحب صدر کے لبوں پر میسم رقص کرنے لگا۔ آپ نے میز پر ہاتھ مار کر مقرر کی ہادہ بیانی کی داد دی۔ سر دار صاحب نے اپنی حوصلہ افزائی ہوئی ہوئی دیکھی تو فسانہ زیادہ بلند آواز سے تقریر کرنے لگے فرمایا۔ غالب اندگڑٹے کی بد قسمتی متھی کہ انہوں نے شرعی دربار صاحب امرتسر کے درشن نہ کیے۔ سچ اگر وہ ضلع گورداس پور بھی نہ جاسکے وہ نہ وہاں کا گڑا کھا کر انہیں نان

ختم اس کے بعد مرزا کاظم اٹھنے اور انہوں نے نہایت فصیح حرمین زبان میں بیان کیا کہ
 پروفیسر نے جس قابلیت کے ساتھ غائب اور گئے کا موازنہ کیا ہے شاید ہی آج تک
 کسی نے کیا ہو۔ کم از کم برلن میں تو ایسی تقریر آج تک نہ ہوئی ہوگی اور مجھے فخر ہے کہ
 میرے ملک نے پروفیسر صاحب جیسے آدمی پیدا کیے ہیں۔ میں اس پوری تقریر کا ترجمہ
 کر کے برلن کے اخبارات میں شائع کراؤں گا۔ اور آپ دیکھیں گے کہ میرے وطن کے
 اہل ادب نے علم و فضل کے کیا کیا دریا بہائے ہیں۔ میں آپ صاحبان کا شکریہ ادا کرتا
 ہوں کہ آپ نے پروفیسر صاحب کے خیالات سننے کی تکلیف گوارا فرمائی اس کے
 بعد صاحب صدر اٹھنے اور انہوں نے پروفیسر صاحب اور مرزا کاظم کا شکریہ عرض
 کی طرف سے ادا کیا اور جلسہ کے اختتام کا اعلان کیا پھر کیا تھا بڑے بڑے ادیب
 شاعر، اخبار نویس اور رئیس سردار صاحب سے مصافحہ کرنے کو چکے اور آپ کو بڑی
 مشکل سے دل کے دروازے تک لے جایا گیا۔ اسی رات کو مرزا کاظم پروفیسر پر ہم
 سنگو کوڑھین پر سوار کرنے کے لیے اسٹیشن تک لے گئے اور دونوں کی جیبیں نوٹوں
 سے بڑھتی تھیں۔

عاجی لی لی

غالب جدید شعر کی ایک مجلس میں

دور جدید کے شعر کی ایک مجلس میں مرزا غالب کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ اس مجلس میں تقریباً تمام جلیل القدر جدید شعرا تشریف فرما ہیں۔ مثلاً م۔ ن۔ ارشد۔ ہیراجی ڈاکٹر قرآن حسین خالص۔ میاں رفیق احمد حاکر۔ راجہ محمد علی خاں۔ پروفیسر خلیفہ احمد خلیفہ بکرا جیت درہا۔ عبدالحی ننگاہ وغیرہ وغیرہ۔ یکایک مرزا غالب داخل ہوتے ہیں ان کی شکل و صورت بھی نہ وہی ہے جو سولہ نا حالی نے یادگار غالب میں بیان کی ہے ان کے ہاتھ میں ”دیوان غالب“ کا ایک نسخہ ہے تمام شعرا ہلڑے ہو کر آداب بجالاتے ہیں۔ غالب! حضرات میں آپ کا نہایت شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے جنت میں دعوت اُجھڑا دیا اور اس مجلس میں مدعو کیا۔ میری مدت سے آرزو تھی کہ دور جدید کے شعرا سے مشرت نیاز حاصل کروں۔

ایک شاعر۔ یہ آپ کی ذرہ فوازی ہے دگر بڑے

وہ آئیں گھر میں ہا سے خدا کی قدرت ہے

کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

غالب۔۔۔ رچنے بھی دیجئے اس بے جا تعریف کو۔ میں آم کو من ماناں۔

دوسرا شاعر۔ تشریف رکھئے گا کئے جنت میں تو خوب گذرتی ہے آپ تو فرمایا کرتے تھے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن۔

غالب۔ (مسکرا کر) مجھی جنت بھی خوب جگہ ہے جب سے وہاں گیا ہوں ایک شعر
مجھی مرزوں نہیں کر سکا۔

دوسرا شعر۔ تعجب اجبت میں تو آپ کو کافی فراغت ہے اور پھر ہر ایک چیز میسر
ہے۔ پیٹنے کو شراب۔ انتقام لینے کو پرہی زاد۔ اور اسکی یہ فکر کو سس دور کہ
ہے آپ کا ہندو اور پھروں ننگ
آپ کا لڑکھ اور کھانڈ اودھ
باد جو اس کے آپ کچھ کہہ.....

تیسرا شعر۔ (بات کاٹ کر) نائے اقبال کا کیا حال ہے ؟

غالب۔ وہی جو اس دنیا میں تھا۔ دن رات خدا سے رونا مچرنا رہی پڑانی بشت
مجھے منکر جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا
پہلا شعر۔ میرا خیال ہے وقت کافی ہو گیا ہے اب مجلس کی کارروائی شروع کی
جائے۔

دوسرا شعر۔ میں کرسی صدارت کے لیے جناب م۔ ن ارشد کا نام تجویز کرتا ہوں
دارشد صاحب کرسی صدارت پر بیٹھنے سے پہلے حاضرین مجلس کا شکریہ
ادا کرتے ہیں۔

م۔ ن۔ ارشد۔ میرے خیال میں ابتداء مرزا غالب کے کلام سے ہونی چاہیئے۔
میں نہایت ادب سے مرزا موصوف سے درخواست کرتا ہوں کہ اپنا کلام ٹپسیں۔
غالب۔ مجھی جہب بہائے سامنے شمع لائی جائے گی تو ہم بھی کچھ پڑھ کر نہا دیں گے
م۔ ن۔ ارشد۔ سمات کیجئے گا۔ مرزا۔ اس مجلس میں شمع وغیرہ کسی کے سامنے
نہیں ۲۷ شمع کے بہائے یہاں پہاس کینڈل باور کا یہ سب ہے اس کی

دشمن میں ہر شاعر اپنا کلام پڑھے گا۔

غالب :- بہت اچھا صائب تو غزل مٹنے
باقی شعراء - ارشاد۔

غالب :- مومن کیا ہے۔

خدا نکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو

ہم تو عاشق ہیں تمنا ہے نام کے

(باقی شعراء کہتے ہیں - مرزا حیران ہو کر ان کی جانب دیکھتے ہیں)۔

غالب :- اچھی صائب یہ کیا حرکت نہ داد نہ تمہیں اس بے موقع خندہ زنی کا کچھ
مطلب -

ایک شاعر :- معاف کیجئے مرزا آپ یہ شعر کچھ بے معنی سا معلوم ہوتا ہے - ؟
غالب :- بے معنی !

بیرونی :- دیکھئے نہ مرزا آپ فرماتے ہیں خدا نکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو - اگر
مطلب کچھ نہیں تو خدا نکھنے کا فائدہ ہی کیا اور اگر آپ مرث مستحق کے نام ہی
کے عاشق ہیں تو تین پیسے کا خط برباد کرنا ہی کیا - مزور سادہ کاغذ پر اس
کا نام لکھ لیجئے۔

ڈاکٹر قرآن حسین :- میرے خیال میں اگر یہ خط اس طرح لکھا جائے تو زیادہ مزوروں پر

خدا نکھیں گے کیونکہ چھٹی ہے جس دفر ہے آج

اور ہا جیے جیہنا ہم کو پڑے ہر رنگ ہی

پھر جی تم کو خدا نکھیں گے ہم مزور

چاہے مطلب کچھ نہ ہو

جس طرح سے میری اک اک قلم کا

کچھ بھی تو مطلب نہیں
خدا نکلیں گے کچھ مخالفت ہے نہیں
میرا مطلب ہے محبت ہے نہیں
یعنی عاشق ہی تبارے نام کے

غالب -

یہ تو اس طرح معلوم ہوتا ہے جیسے آپ میرے اس شعر کی ترجمانی کر رہے
ہیں -

بہت رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھتا تھا کہ سے کوئی
پیراجی - جنوں! جنوں کے متعلق مرزا میں نے کچھ عرض کیا ہے - اہانت ہو تو
کہوں -

غالب ہاں، ہاں بڑے شوق سے -

جنوں ہوا جنوں ہوا
مگر کہاں جنوں ہوا
کہاں ہوا وہ کب ہوا
ابھی ہوا یا اب ہوا
نہیں ہوں میں یہ بات
مگر جدید شاعری
میں کہنے کا جو شوق ہے
وہیں ہی وہم ہے کہ
دماغ میرا چل گیا

یہی سبب ہے جو مجھے

جنوں ہوا جنوں ہوا

غالب :- (ہنسی کر دکتے ہوئے) سہان اللہ کیا برجستہ اشعار ہیں۔

م۔ ی۔ ارشد :- اب مرزا غزل کا دوسرا شعر فرمائیے۔

غالب :- میں اب مقطع ہی عرض کروں گا۔ کہنا ہے ع

عشق نے غالب نکٹا کر دیا

ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

عبدالحمیٰ نگاہ :- گستاخی مسمان مرزا۔ اگر اس شعر کا پہلا مصرعہ اس طرح مکتا

جائے تو ایک بات پیدا ہو جاتی۔

غالب :- کس طرح؟

عبدالحمیٰ نگاہ :- عشق نے ہاں ہاں تمہارے عشق نے

عشق نے مجھے تمہارے عشق نے

مگر کو نکٹا کر دیا

اب نہ اٹھ سکتا ہوں میں

اور چل تو سکتا ہی نہیں

جانے کیا بخت ہوں میں

یعنی نکٹا کر دیا

اتنا تمہارے عشق نے

گرتا ہوں اور اٹھتا ہوں میں

اٹھتا ہوں اور گرتا ہوں میں

یعنی تمہارے عشق نے

اتنا لگتا کر دیا

غالب طنز آ۔ بہت خوب بھی غضب کر دیا۔

خیط احمد غیظ۔ اور دوسرا مصرعہ اس طرح لکھا جاسکتا تھا۔

جب تک نہ مجھ کو عشق تھا

تب تک نہ مجھ کو ہوش تھا

سب کام کر سکتا تھا میں

اور دل میں میرے ہوش تھا

اس وقت تھا میں آدمی

اور آدمی تھا کام کا

لیکن تمہارے عشق نے

مجھ کو نکما کر دیا

غالب۔۔ دائرۃ کمال ہی تو کر دیا بھی۔ اب آپ لوگ اپنا اپنا کلام سنائیں۔

م۔ ن۔ ارشد۔۔ اب ٹاکٹر قرآن حسین خالص جو بدیدہ شاعری کے امام ہیں
اپنا کلام سنائیں گے۔

ٹاکٹر خالص۔۔ اچھی ارشد صاحب میں کیا ہوں اگر میں امام ہوں تو آپ مجتہد ہیں۔
آپ بدیدہ شاعری کی منزل ہیں اور میں سنگ میل اس لیے آپ اپنا کلام
پہلے پڑھئے۔

م۔ ن۔ ارشد۔۔ توبہ توبہ اتنی کسر نفسی اچھا اگر آپ مصرعیں تو میں ہی اپنی نظم
پہلے پڑھتا ہوں۔ نظم کا عنوان ”بدلہ“ عرض کیا ہے۔

آمری جان میرے پاس انگلیسٹی نصیر دہ

جس کی آغوش میں یوں تاج رہے ہیں شعلے

جس طرح دور کسی دشت کی تنہائی میں
رقص کرتا ہو کوئی جھوٹ کر جس کی آنکھیں
کرم شب تاب کی مانند چمک اٹھتی ہیں
ایسی تشبیہ کی لذت سے منکر دور ہے تو
قرب ایک اجنبی انہماں سی محبت ہے جسے
رقص کرنے کے سوا اور نہیں کچھ آتا
اپنے بے کار خدا کے مانند

دور ہو کر جو کبھی بیٹھے ہوئے دفتر میں
خود کشی کا لمحے یک لخت خیال آتا ہے
میں بکراؤ اٹھتا ہوں یہ جینا بھی ہے کیا جینا
اور یہ چپ چاپ رہ چکے ہیں سے ہر مہلتا ہوں

آمری جان میرے پاس انگلیشی کے قریب
تاکہ میں چم ہی کس عارضی شگاف ترا
اور ارباب وطن کو یہ اشارہ کر دوں
اس طرح چلتا ہے اختیار سے بدارشاد
اور شب جیسے گزر جانے پر
بہر جمع دردم و دام نکل جاتا ہے۔

ایک بڑے سے تھکے مانند سے رہوار کے پاس
جھڑ کر بستر منہاب و سحر

نظم میں کراسمین پر وہد کی حالت طاری ہو جاتی ہے میراجی یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں یہ نظم اس صدی کی بہترین نظم ہے۔ بلکہ میں تو کہوں گا۔ اگر ایک طرح سے دیکھا جائے تو اس میں انگلیسی، عجمیت اور دفتر تہذیب و تمدن کی مخصوص الجھنوں کے حامل ہیں۔

حاضرین ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے زیر لب مسکراتے ہیں۔

غالب اور ارشد صاحب معاف کیجئے گا۔ آپ کی یہ نظم کم از کم میری فہم سے تو بالاتر ہے۔

خیط احمد غیظہ اور یہ صرف ارشد پر کیا منظر ہے مشرق کی جدیدیت عربی ایک بڑی حد تک مبہم اور انداک سے بالاتر ہے۔

م۔ ن۔ ارشد اور شفا میرے ایک دوست کے اس شعر کو نیچے دے

پاپوش کی کیا نگر ہے دستار شہباز

پایاب ہے جو موج گذر رہا ہے گل سرخ

اب بتائیے اس شعر کا کیا مطلب؟

غالب اور شرک کو ذرا کر۔ سچ تو یہ ہے کہ اگرچہ اس شعر میں سر اور پیر کے اضافہ شامل ہیں مگر باوجود ان کے اس شعر کا نہ سر ہے نہ پیر۔

م۔ ن۔ ارشد اور امجد چوٹھے اس حرف گیری کو آپ اس شعر کو سمجھے ہی نہیں مگر خیر اس بحث میں کیا رکھا ہے کیوں نہ اب ڈاکٹر قربان حسین خالص سے وضاحت کی جائے کہ اپنا کلام پڑھیں۔

ڈاکٹر خالص اور میری نظم کا عنوان ہے "عشق" عرض کیا ہے

عشق کیا ہے؟

میں نے تک عاشق سے پوچھا
 اس نے یوں رو کر کہا
 عشق اک طرفان ہے
 عشق اک سیلاب ہے
 عشق ہے اک زلزلہ
 شدہ جہاں عشق
 عشق ہے پیغام موت

غالب :- بھی کیا شاق ہے نظم پڑھے سنا مرے میں نشر کیا کام !
 ڈاکٹر خالص :- (جھنجھاکر) تو کیا آپ کے خیال میں یہ نشر ہے ؟ یہ ہے آپ کی سن
 فہمی کا عالم اور فرمایا تھا آپ نے ۔

ہم سن فہم ہیں غالب کے مرزا نہیں

غالب :- میری سبھ میں نہیں آیا کہ کسی قسم کی نظم ہے ۔ نہ ترجمہ ۔ نہ قافیہ ۔ نہ روایت ۔
 ڈاکٹر خالص :- مرزا صاحب یہی تو جدید شاعری کی خصوصیت ہے آپ نے اردو
 شاعری کو قافیہ اور روایت کی فولادی زنجیروں میں قید کر رکھا تھا ۔ ہم نے اس
 کے غلاف جہاں کے اسے آزاد کیا ہے اور اس طرح اس میں وہ اوصاف
 پیدا کئے ہیں جو محض خارجی خصوصیات سے کہیں زیادہ اہم ہیں میری مراد
 رفعت تخیل کی آزادی اور ندرت فکر سے ہے ۔

غالب :- رفعت تخیل ۔ کیا غیب پر دواز ہے ۔

میں نے تک عاشق سے پوچھا اس نے یوں رو کر کہا
 ڈاکٹر خالص :- (دھڑکے عاشق رو کر نہیں کہے گا تو تہقکہ لگا کر کہے گا ؟
 مرزا آپ یہ بھی نہیں جانتے کہ عشق اور رو نے میں کتنا گہرا تعلق ہے ۔

غالب ۱۔ مگر آپ کو تافہ اور رویت ترک کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔

رفیق احمد خان غفر ۱۔ اس کی وجہ سفری تفتیشیں بلکہ ہماری طبیعت کا فطری میلان ہے جو زندگی کے دو حصے شبوں کی طرح شعرا و ادب میں بھی آزادی طبعاً ہے اس کے علاوہ دور پر یہ کی روح انتداب کش مکش تحقیق و تبیین منقش پرستی اور جذبہ سے ماحول کی اس تبدیلی کا اثر ادب پر ہوا ہے اور میر ہے اس نکتے کو تسلیم کرنے میں بھی اپنی کتاب رضی فیہ میں تسلیم کیا ہے چنانچہ اس لیے ہم نے محسوس کیا ہے کہ قدیم شاعری ناقص ہونے کے علاوہ روح میں وہ لطیف برہنیت پیدا نہیں کر سکتی جو مثال کے طور پر کٹر خاص کی شاعری کا جو ہر ہے قدیم شعرا اور یہ شاعر کے ماحول میں زمین و آسمان کا فرق ہے قدیم شعرا بقول مولانا، اگر اوجس و عشق کی کی حدود سے باہر نہ نکل سکے اور ہم جن میدانوں میں گھوڑے دوڑا رہے ہیں ان کی وسعت کی انتساب ہے اور نہ ان کے عجائب و لطائف کا شمار غالب ۱۔ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

م۔ ن۔ ارشد ۱۔ مگر صاحب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم ایک نئی دنیا میں رہتے ہیں یہ ریڈیو، ہوائی جہاز اور دھماکے سے پھٹے نئے عمارتوں کی دنیا ہے۔ یہ صبر کا بے کاری۔ انقلاب اور آزادی کی دنیا ہے۔ اس دنیا میں رہ کر ہم اپنا وقت حسن عشق و میل شیریں فرہاد کے مسافروں میں ضائع نہیں کر سکتے۔ شاعری کے لئے اور بھی موضوع سخن ہیں جیسا کہ ہمارے ایک شاعر نے کہا ہے۔

آج تک سرخ وسیہ صدیوں کے سائے تلے

آدم و حوا کی اولاد پہ کیا گزری ہے

موت اور زیست کی روزانہ صفت آرائی ہے

ہم پہ کیا گزرتا ہے گی اس بار پہ کیا گزری ہے

یہ حسین کیت چٹا پڑتا ہے برہنہ بن کا
یہ ہر اک سمت پڑا سر کڑی دیواریں

یہ بھی ہیں ایسے کئی اور بھی مضمون ہوں گے

راجہ محمد علی خاں :- بہت خوب ہے یہ بھی ہیں ایسے کئی اور بھی مضمون ہوں گے ایسے ہی

مضامین میں سے ایک مضمون "ٹاک خانہ" ہے جو میری اس نظم کا جو میں ابھی

آپ کے سامنے پیش کروں گا۔ موضوع ہے

غائب۔ ٹاک خانہ ؟

راجہ محمد علی خاں :- مرزا، کس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے نیلے عزم کیا ہے ؟

ٹاک خانے کے ہے انداز آج ات کتنا جہم

ڈانے کو خط کھڑے ہیں کسی قدر ان آدمی

ان میں ہر اک کی قضا ہے کر وہ

ٹاکو جلدی سے خط یا پارسل

بھاگ کر دیکھے کر اسکی سائیکل

ہے پڑی باہر جہاں رکھ کر لے

ٹاک خانے میں آیا تھا وہ خط ڈانے

چار ہے ہیں خط چہارا طرات کر

دیکھنا آئی ہے اک عورت لٹاؤ ڈانے

بہن کو مصر کو لندن کو کہہ قاف کو

کون کتا ہے کہ ایک عورت ہے یہ

یہ تو لاکا ہے کسی کالج لاکر

جس کے ہال

خدا منزل

اس قدر ملنے ہیں عورت سے کہ ہم
 اس کو عورت کا سمجھتے ہیں بدل
 اُنٹ ہمارے مغز نشین
 ہے مگر کس شخص کا یہ سب قصور
 کیا نظر میری نہیں کرتی ہے کام
 جھپٹ سا ہو گیا ہے شام کا
 یا ہمارے ہت قدم کا قصور
 کہ ہمارے نور ہاں
 ڈاک خدے میں ہیں جب آتے لفظ ڈالنے
 اس قدر دیتے ہیں وہ دھوکا ہمیں
 کہ نظر آتے ہیں ہم کو عورتیں

دختروں کی داد دی جاتی ہے ہر طرف مرزا جی کمال کر دیا کے ضربے ملنا ہوتے ہیں
 مرزا غالب کی سراہی ہر لمحہ بڑھتی جا رہی ہے،
 م - ن - ارشد - اب میں ہندوستان کے مشہور شاعر پروفیسر غلط سے درخواست
 کروں گا کہ وہ اپنے تازہ افکار سے ہمیں نازیں -
 پروفیسر غلط - میں نے تو کوئی نئی چیز نہیں کہی -

ہیراجی - تو چہرہ ہی نظم بنا دیجئے جو پہلے دنوں ریڈیو والوں نے آپ سے کھوانا تھی
 پروفیسر غلط - آپ کی مرضی تو وہی تھیجئے - عنوان ہے ”لنگان“

فن پر یا دل زار انہیں فن نہیں
 سائیکل ہو گا کہیں اور چلا جائے گا

دُھل چکی رات اُترنے لگا کھبوں کا بھار
 کہیں باغ میں ٹکڑاٹے لگے سرور چراغ
 خشک گیا رات کو ہر اک چوکیدار
 گل کرو دامنِ افسردہ کے بوسیدہ دماغ
 یا آتا ہے مجھے سرورِ دُنب نہ دار
 پہنچے غراب گھر دُند سے ہی کو واپس لوٹ
 اب یہاں رُمن نہیں - کوئی نہیں آئے گا

دُنگم کے دوران کٹر مسرے دو دو جگہ چار چار پڑھوائے جاتے ہیں اور پروفیسر
 خلیفہ بار مرزا غائب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دیکھتے ہیں مرزا غائب بہت ہیں،
 م۔ ن۔ ارشد۔ حضرات میرے خیال میں یہ کون مسرے تھے؟ سے جگہ اس میں شامل کرنے
 کتاب کے ایڈیٹر فائنلٹ جہاز کو غائب نہایت۔

رفیق احمد۔ سرورشی کے انداز میں ہیراجی سے، بجواس ہے
 م۔ ن۔ ارشد۔ اب ہیراجی اپنا کلام پڑھیں گے۔
 ہیراجی۔ میری نظم کا عنوان ہے جنگل۔
 غائب۔ جنگل!

ہیراجی۔ جنگل اور پُرم کی صفت میں قصیدہ کہہ سکتے ہیں تو کیا میں جنگل پر نظم کہنے
 کا حقدار نہیں۔

غائب۔ صاف کیجئے گا نظم پڑھئے۔

ہیراجی۔ عرض کیا ہے

جنگل جنگل کی صوب نیاری
 رنگ میں ہر دم کرشن مراری

ہاں گئی ہیں سکھیاں پیاری
 رادھا رانی آہی گئی تو —
 کرشن کنہیتا ڈھونڈھو رہے ہیں
 لیکن میں تو بھول چکا ہوں
 بیگن سے یہ بات پل صقی
 مہوک لگی ہے کستی ہائے
 جی میں ہے اک جھون کے بیگن
 کھاؤں لیکن رادھا پیاری
 رنگ کو اس کے دیکھ کے بلے کر
 یاد آتے ہیں کرشن مراری
 اس لیے مہوکا رہتا بہتر
 چنچل میں ہوں پریم بھاری

دھرم سے داد دی جاتی ہے بعض شعرا کتنے دے سنے جاتے ہیں مگر
 ہدیہ شاعری میراجی ہی کا حصہ ہے۔

م۔ ن۔ راشد۔ اب جناب دکرماجیت صاحب درمنا سے استدعا کی جاتی
 ہے کہ وہ اپنا کلام سنائیں۔

دکرماجیت درمنا۔ میں نے حسب معمول کچھ گیت کہے ہیں۔

غالب۔ (حیران ہو کر) شاعر اب گیت کہہ رہے ہیں میرے استاد و نیا اب
 کہ مر جا رہی ہے۔

دکرماجیت درمنا۔ مرزا آپ کے زمانے میں گیت شاعری کی ایک باقاعدہ صنعت
 قرار نہیں دیئے گئے تھے درجود کے شعراء نے انہیں ایک قابل عزت

صنعت کا درجہ دیا ہے۔

غالب ۱۔ جی ہاں ہمارے زمانے میں عورتیں مہاندھیر اسی یا اسی قماش کے اور
رنگ گیت لکھ کر تے تھے۔

دکرماجیت درما۔ پہلا گیت ہے ”برہن کا سٹپس“ عرمن کیا ہے۔

اڑ جا دیس دیس رے کئے اڑ جا دیس دیس

مُن کر قری کاٹیں

غالب ۱۔ مُن کر قری کاٹیں کاٹیں

دکرماجیت درما۔ عرمن کیا۔

مُن کر قری کاٹیں کاٹیں

آنکھوں میں آنسو سہراٹیں

ہل یہ قرے من کو بھائی

مت جانا پردیس سے کئے اڑ جا دیس دیس

م۔ ن۔ ارشد۔۔ بھیج کیا اچھوتا خیال ہے چندت صاحب میرے خیال میں ایک

گیت آپ نے کبوتر بھی لکھا تھا وہ بھی مرزا کو سننا دیجئے۔

دکرماجیت درما۔ سنئے۔ پہلا ہل ہے ”ہل کبوتر ہل“

دیکھ کوٹیا کوک رہی ہے

من میں میرے ہوک اُسٹی ہے

کی ستر کو بھی سہوک لگی ہے

ہل غراغوں ہل کبوتر

ہل کبوتر ہل

باقی شعراء۔۔ ایک زبان ہوک ہل کبوتر ہل کبوتر ہل کبوتر ہل۔

داس اٹنا میں مرزا غالب نہایت گھبراہٹ اور سراپنگی کی حالت میں دروازے
کی طرف دیکھتے ہیں،
بکرماجیت دروازہ۔ اب دوسرا بند بنیے۔

بول کبوتر بول
کیا میرا سا جن کہتا ہے
کیوں مجھ سے روٹتا رہتا ہے۔
کیوں میرے ٹھننے سہتا ہے
جسید پر سائے کھول۔ کبوتر
بول کبوتر بول
روایتی شعراء ایک زبان ہو کر بول کبوتر بول کبوتر بول۔
داس شہر و محل کی تاب نہ لا کر مرزا غالب مہاگ کر کمرے سے نکل جاتے
ہیں۔

کنہیا لال کپور

♦ ~ ~ ~ ~ ~ ♦

غالب کے مصرعے

جس طرح اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ غالب شاعر تھے۔ اسی طرح اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ غالب نے مصرعے پڑھے اور اشعار بعد میں۔ ہر شاعر آزاد شاعروں کو چھوڑ کر پہلے مصرعہ کہتا ہے اور بعد میں شعر۔ وہ مصرعہ اولیٰ ہوا مصرعہ ثانی۔ بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ پہلے مصرعہ میں شاعر اپنا پرہیز طلب بیان کر چکتا ہے لیکن پھر شعر کے لیے دو مصرعوں کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اس لیے وہ ایک مصرعہ بطور ”پانچ“ لگا دیتا ہے تاکہ مصرعہ شعر بن جائے۔ بیشتریں بھی ہوتا ہے کہ شاعر مصرعہ ثانی پہلے لکھ دیتا ہے اور جب وہ شعر مکمل کرنے کے لیے دو مصرعے اکٹھا کرتا ہے تو پہلی چوکس نہیں بیٹھتی اور معانی میں کچھ ”گڑ بڑ“ محالاً ”پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی لیے کسی شاعر کے صحیح خیالات اور مطالب جاننے کے لیے ضروری ہے کہ اشعار کے بہانے اس کے مصرعوں کی تشریح کی جائے۔ غالب کے یہ چند مصرعوں کی تشریح ”یارانِ نکتہ دہاں“ کے لیے۔

”مصلحتی عام“ کی حیثیت رکھتی ہے۔

”لوگوں جیتا ہے تری نعت کے سر پہ نکتہ“

حقیقت یہ ہے کہ غالب نے اس مصرعہ میں کوئی نکتہ ہی دیا بند کر دیا ہے مطلب

اس کا یہ ہے کہ غالب کے محبوب نے اُس سے اپنا سر منڈا دیا رکھا ہے۔ غالب اس سے وصل کے لیے کہتے ہیں، محبوب پہلے تو میلے بہانے کرتا ہے اور پھر کرتا ہے مگر نہیں منکدر، منکدر مطالبہ جب مانا جائے گا جب اس "چٹیل میدان" پر بال آگ آئیں گے اور سر پر زلفیں ہوجائیں گی۔ اب ظاہر ہے بال آگنے کے لیے اور پھر زلفیں بننے کے لیے کم از کم دو تین برس درکار ہیں۔ اس لیے غالب کہتے ہیں۔ جب تجھے زلفیں آئیں گی اس وقت تک کون بے گنا؟

”آج داں تیغ و کفن باندھے ہوئے حبانا ہوں میں۔“
 غالب کا یہ مصرع پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت اگر علامہ مشرقی نہیں تو خاکسار تحریک مزدور موجود تھی اور غالب خود خاکساروں میں جھرتی ہو چکے تھے۔ چنانچہ اس مصرع سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہی میں اُن دنوں خاکساروں کا کوئی بنگالہ جلسہ ہوتا تھا۔ اس لیے غالب کہتے ہیں کہ آج وہاں یسین جلسہ میں تیغ و کفن باندھ کر جاتا ہوں۔ ہو سکتا ہے اس وقت خاکسار بیلے کی جگہ تیغ یسین اُستار کہتے ہوں۔

”لوگ نامے کو رستا باندھتے ہیں۔“

اس مصرع سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب چٹائی بھی جانتے تھے۔ کیونکہ اس میں ”نامہ“ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور نام چٹائی میں ازار بندہ کو کہتے ہیں۔ اس مصرع کا مطلب یہ ہے کہ جب لوگوں کے پاس پاشا مار یا شلوار میں ڈالنے کے لیے اٹا باندھ نہیں ہوتا تو وہ اس کی جگہ رستا ڈال کر شلوار یا پاشا مار باندھ لیتے ہیں۔ غالب نے مصرع میں اُس وقت کی معاشرت کا نقشہ کھینچا ہے۔ رستا مشدّد تھا لیکن ”مزدور شری“ کے لیے استعمال کر دیا گیا ہے۔

”نہیں نگار کو اُفت نہ ہو نگار تو ہے“

غائب پہن ہی سے بڑے رنگیں مزاج واقع ہوئے تھے اور جہانی میں دہلی کے باغوں میں قدم رکھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے اس معرہ میں غلام ایکٹریس نگار سے مذاں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ غائب کو مستقبل کا بھی علم تھا۔

”جلوہ از بس کہ تھا حنائے نگہ کرتا ہے“

یوں معلوم ہوتا ہے جیسے اس وقت دہلی میں بسیں چلتی تھیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ”قریشی بسیں“ نہ ہوں، مگر چلتی منزل درختیں۔ چونکہ بسوں میں آغزی سیٹیں یا بعض بسوں میں اگلی سیٹیں ”شاد نازک خیالوں“ کے لیے مخصوص ہوتی ہیں اس لیے ہر شخص اس عرصہ دیکھنے پر مجبور ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ بس ڈرائیوڈ بھی اپنے سامنے چھوٹا سا شیشہ لگا کر تقریباً کا سامان بندے رکھتا ہے۔ غائب اس معرہ میں یہی کیفیت بیان کرتے ہیں چنانچہ کہتے ہیں کہ بس کا جلوہ اتنا رنگین ہے کہ جلہ بخود اپنی طرف دیکھنے کا تقاضا کرتا ہے۔

”اگر اس طرۂ تجھ ہیچ و خم کا ہیچ و خم نکلا“

بعض لوگ کہتے ہیں کہ غائب کو اپنی بیوی امراؤ بیگم سے انتہائی محبت تھی ہو سکتا ہے یہ بات اپنی جگہ درست ہو سکتی ہے کسی ایک حقیقت ہے کہ غائب کو کسی سے محبت تھی — محبت کس سے تھی؟ اس کا جواب اسی معرہ میں موجود ہے یہ معرہ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مشرق کوئی مہارت کی ایک کم گنتی والی قوم سے تعلق رکھتا تھا۔ جس کے ”جوڑے“ میں بڑے ہیچ و خم تھے۔ ”جوڑا“ یا ”جگہ

سے وہ فی معمول طور پر لبا ہو جاتا تھا۔ اس بے غائب کہتے ہیں کہ اگر تم اس قرۃ العین سے ملو گے تو کوکھول دو، تو تمہارے قد کی لمبائی کا سا سامیہ کھل جائے کر تم کہتے۔
بچہ ہوا؟

”اے مادرِ نشانِ جگر سوختہ کیا ہے؟“

چونکہ جگر مراد آبادی کا رنگ سیاہ ہے اور چہرے پر گہرے داغ بھی ہیں، اس بے غائب نے ”جگر سوختہ“ یعنی جگر جگر کہ کر ان کی طرف اشارہ کیا ہے اور اپنے نام سے پوچھتے ہیں کہ یہ جگر سوختہ کس نشان کیسے ہیں؟ جبکہ وہ پہلے ہی سوختہ ہے۔ جگر مراد آبادی کے متعلق انہوں نے کئی مصرعے لکھے ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں۔
”لذتِ ریشِ جگر، غرقِ ”نکدائ“ ہوتا۔“

پڑھو جگر صاحب کی دارُ صمی بھی ہے۔ اس بے غائب کہتے ہیں کہ جگر مراد آبادی کی دارُ صمی کی لذت اُس وقت ہے جب وہ ”نکدائ“ میں غرق ہو جائیں اور ان کی دارُ صمی بے کار ہے۔ ایک جگہ غائب نے جگر مراد آبادی کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف بھی کیا ہے۔ ج

کیا کس نے جگر داری کا دعویٰ؟

اسی ”جگر“ کے متعلق ان کے کلام میں بہت سے مصرعے ملتے ہیں۔

”وہ ہے اس شوق سے آذر وہ ہم چندے ٹکٹ سے“

لہذا اس وقت کسی مسجد کے لیے چندہ اکٹھا کیا جا رہا تھا اور چندہ اکٹھا کرنے والوں میں غائب بھی شامل تھے۔ غائب نے سوچا۔ چلو اپنے محبوب سے بھی چندہ میں چنانچہ محبوب کے پاس پہنچے کہ مسجد کے لیے چندہ دو۔ اُس نے آگے سے ٹکاسا جواب دیا۔

اس پر غالب ناراض ہو گئے اور اسی کیفیت کا اظہار انہوں نے اپنے اس مصرع میں کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ ہم چندے کے تکلف سے اس شمع سے کئی روز تک ناراض رہے۔

”خُز قیس کوئی اور نہ آیا بردے کار“

اس مصرع سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان دنوں قیس، یعنی مجنوں وہلی آیا ہوا تھا، دوسری یہ کہ غالب نے کار کی سیر بھی کی ہے، گویا اس سیر کا ذکر انہوں نے کہیں نہیں کیا مگر اس مصرع سے یہی پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ مطلب یہ ہے کہ غالب کسی کی کار میں دیکھو ان کی اپنی کار نہیں تھی، بیٹھ کر کہیں جا رہے تھے کہ راستے میں قیس اور کچھ آدمی ملے۔ ان میں شرط یہ لگی کہ دیکھیں، غالب صاحب کی کار کے آگے کون آتا ہے؟ جب کار قریب آئی تو سب ٹہ گئے۔ مگر قیس، یعنی مجنوں کار کے آگے آ گیا۔ تو اسی واقعہ کو انہوں نے اس مصرع میں بیان کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ قیس کے سوا بردے کار یعنی کار کے آگے کوئی نہ آ سکا۔

”آپ آتے تھے مسخر کوئی مناں گیر بھی تھا“

سنا گیا ہے کہ غالب کے وقت پاکیاں راجے متقی اور عورتیں پاکلیوں میں بیٹھ کر آتی تھیں۔ لیکن غالب کے اس مصرع سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت گھوڑے کی سواری بھی عام تھی۔ عورتیں گھوڑوں پر سوار ہو کر آتی تھیں اور غالب کا مشوق بھی گھوڑے پر سوار ہو کر اس سے ملنے آیا کرتا تھا۔ ایک روز ان کا محبوب گھوڑے پر سوار اور ہاتھ کا راستہ میں دوسرے آٹن نے گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور اسے کچھ دیر کے لیے روک لیا۔ غالب کو اس

بات کا پتہ مل گیا کہ یہ رقیب کے پاس ٹھہرا ہے۔ چنانچہ محبوب کو طرز کرتے ہوئے کہتے ہیں:-

یہ ماما کو تم آکر ہے تھے۔ مگر تم سے گھوڑے کی جاگ بچ کر تمہیں روکنے والا بھی کوئی دہاں موجود تھا۔

شفیع عقیل

~~~~~



نفسِ نازِ ثبت طفت از پہ آغوشِ رقیب  
پائے طافِ کس پئے حسدِ مانی مانجے

انخاب

## غالب کے اشارے

مئی جولائی ۱۹۵۶ء میں شعر و سخن سے الہامی تعداد ہزار غالب خواب میں نظر آئے، کچھ غزلیں سنائیں۔ مجھ سے فرانسس کی کہ میں اپنا کلام سناؤں۔ میں نے اس تاریخ تک کہیں تک بندی کا بھی ارتکاب جرم نہیں کیا۔ یہ ۱۹ جولائی ۱۹۵۶ء کی واردات ہے۔ ۱۰ جولائی ۱۹۵۶ء کو الہامی طریقہ سے ایک شعر آیا اور اسی دن ایک غزل مرتب ہو گئی۔

غزلوں کی تعداد اب ایک سو کے قریب پہنچ گئی ہے، سب اسی میدان اور نوعیت کی ہیں۔ میرا فلسفہ اور طرز بیان جیسا کہ آپ دیکھیں گے خراب ہے۔ نئے الفاظ، نیا تنخیل، نئی اسانفتیں، نئی بندشیں عرضیکہ محنت ہیں اصحاب کو اچھا خاصا میدان غامض فرمائی کے لیے ملے گا۔

اس اعلان کے ساتھ ایک نیا شعر طبع ہوا ہے۔ یہ نیا شعر اس وقت باسٹ کے پیٹے میں ہے۔ زندگی میں کہیں شعر سے ملاقات نہیں ہوئی تھی میں ڈپٹی کلکٹر کی فیشن ہوئی تو غالب خواب میں نظر آیا، اور شاعری کا چسکا جی کر نکلا گیا۔

ایکے جوان شاعر نے یہ احوال سنا، تو بہت رشک کیا کہ زندگی کے سارے کاموں سے فراغت کے بعد آخر میں شاعری نے گھیر لیا ہے اور شہنشاہ سانس بھر کر بولا

”غائب نے ہمارے ساتھ بہت زیادتی کی ہے شروع جانی ہی میں ہیں غائب میں  
نظر آگئے۔“

مگر اس ہمسٹار شاعر کے دوسرے بیان نے غائب کے خلاف شدید رد عمل  
پیدا کیا۔ محمد غضنفر علی صوفی کا دوسرا بیان یہ ہے کہ ”غائب نے مجھے شکر کہنے پر ابک یا اور  
مجھے اہانت دے دی کہ میری شاعری پچھلے پچاس برس کی ساری شاعری کو مات دے  
دے۔“

نئے شاعروں میں یہ غم و خمد ہے کہ غائب اپنے آپ کو سات بچائے گا۔ بعد میں  
آنے والوں کے لیے محمد غضنفر علی صوفی کو جھوٹا دیا۔

بہر حال محمد غضنفر علی صوفی نے غائب میں جیسی یکسوئی ہے اور غائب سے جس پر  
دار حاصل کی ہے اس کا خونہ ملا کر فرمایا ہے

ہے روشنی راز ہستی مثل آب کائنات دل میں  
قصوت ہے مرا ایسا بھر فلسفہ دل میں  
کس علاقہ ہے بسمل میں کہ استقبال کائنات  
قصود ہے مصدق گوئی ہے مرزا دل میں  
نہیں لاتی پیام ان کا تو کشف دل کو کیا سمجھی  
خیل خام میں ہے مبتلا حق صبا دل میں  
زمسلم ہے نہ طمد ہے نہ سوس ہے نہ کاخرچہ  
تو پھر صوفی بتا دے تیرے کیا حوصلہ دل میں

خندان



## غالب اور شریک غالب

اوسر کئی مہینوں سے مکان کی تلاش میں شہر کے بہت سے حصوں اور گوشوں کی خاک جھانکنے اور کئی محلوں کی آب و ہوا کو غونے کے طور پر چکینے کا اتفاق ہوا تو پتہ چلا کہ جس طرح ہر گل کے لیے کم سے کم ایک کم قول چسپاوری، ایک گھر کا شیریں، ایک رٹا کا ساس، ایک بد زبان ہوا، ایک نصیحت کرنے والے بزرگ، ایک فضیلت پائی جانے والا درندہ اور محالے مزدوری سے فارغ ہوتے ہوئے بہت سے بہن کا ہونا لازمی ہوتا ہے۔ اسی طرح کسی نہ کسی جیس میں ایک ماہر غائبیات کا ہونا بھی لازمی ہوتا ہے اور نیز اس کے گرد پیش کا جزافیہ کچھ اور سوارہ ہوتا ہے۔

اچھا سبلا ایک مکان مل گیا تھا لیکن ابھی اس منہوا سبب دیرانی میرا پٹا ہوا بستر بھی ٹھیک سے کھل نہیں پایا تھا کہ محلے کے ماہر غائبیات نے نہیں معلوم کیسے سو گھبرا کر میں سنن فہم نہ سہی غالب کا طوقدار مزدور ہوں اور مجھے اپنی غالبانہ گرفت میں ایک صید نہوں کی طرح جکڑ لیا۔ آتے ہی آتے انہوں نے غالب کے متعلق دو چار حیرت انگیز انکشافات کے بعد مجھے چھانسنے کے لیے ایک آدھ کچکے چھلکے سوالات کر دیے۔ اب میری حماقت ملاحظہ ہو — کہ دل ہی دل میں اپنے آپ کو بہت بڑا غالب فہم سمجھتا — میں نے اُن کو نرم چادر سمجھ کر ان پر دو بار منہ مار دیا۔ یہی دلیوں سمجھ لیجئے ران کی دم پر

پیر کہو یا یمن ان کے سامنے غائب کو اپنے عضو میں ڈال دے نگاہ سے پیش کرنے کی قسمی  
 لا حاصل کر بیٹھا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ میں کسی باد کے خزانے کے قریب دیاستانی پہنچنے  
 کی کوشش کر رہا ہوں؟ پھر کیا تھا آپ غائب کو غلط سمجھے ہیں، چچ کر باہر غابیات  
 جھٹ کر پڑے مجھ پر! اور میری معلومات میں اضافہ کرنے کے لیے فن غابیات کی یہی  
 ایسی قواعد اساتذہ فن فن کے دلہنے کھیل دیے کہ میں سراسیمہ، مبہوت اور  
 ششدر ہو کر جھٹ کے لیے حمد کر بیٹھا کہ اب آئندہ کسی اجنبی بزرگ کے سامنے  
 حضرت غائب کا نام اپنی زبان سے نکالنے سے ہرگز ہرگز نکلنے نہ دوں گا۔

”دوسرے ہی دن سے باہر غابیات نے آپ غائب کو غلط سمجھے ہیں کے عنوان  
 سے میری باقاعدہ تعلیم شروع کر دی۔ سو میرے میں بستر ہی پر ہوتا کہ وہ ”لذت خواب  
 سحر“ پر وحادہ بولتے آپ نے“ اور پٹے غائب کے کچھ انتہائی مشکوک اشعار پڑھ کر ان  
 معنی مجھ سے پوچھتے گئے ”میرا آکھوتہ کھوتہ“ اور پھر قبل اس کے کہ میں ایک نکتہ بھی اپنی  
 زبان سے نکال پاؤں وہ آپ غائب کو غلط سمجھے ہیں“ فرما کر ان کے معنی اور مطالب خود  
 بیان کرنا شروع کر دیتے اور پھر اپنی ”گل افشان گفتار“ سے جدت آفرینی، حسن  
 تخیل، لطیف بیان، شکوہ، الفاظ، جملہ پروازی قدرت کلام جگہ چپا تھس کر بانسی اور زانی  
 کو پہاڑ بنانے کے ایسے ایسے ”گل کرتے“ کو میرے لیے ”صاحبتہ و شہد و سیاب“ کا  
 عالم ہو جاتا اور وہ خود اس شعر کی جہم تفسیری کر رہ جاتے تھے

آگہی دام شغیدن جس قدر جا ہے بچائے

دعا حقا ہے اپنے عالم تعزیر کا

اور پھر زبنت یہاں تک پہنچتی کہ میں داڑھی بنا رہا ہوں اور وہ غائب کا فلسفہ  
 حسن کبار ہے ہیں۔ میں گلگلا کر رہا ہوں اور وہ آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز ہیں  
 مسدود آقا کو پہاڑن چڑھتے دیکھ رہے ہیں۔ میں کپڑے بدل رہا ہوں اور وہ سیریلی ہرق

خزمن کا سے خون گرم دھتیاں کا۔ پڑھ پڑھ کر اور گھا ہے بگا ہے انقلاب زندہ با  
 کا لغو رنگا رنگا غائب کو بندوستان کا سب سے پہلا انقلابی ثابت کر رہے ہیں  
 میں جرتے کی ڈوریاں باندھ رہا ہوں اور وہ نہیں گئے اور ستارے اب آسمان  
 کے لیے، والے مسرع سے نھائے آسمانی پراسٹنگ چھوڑ رہے ہیں۔ یہی  
 ناشتہ کر رہا ہوں اور وہ "سے ہے یہ گس کی تے نہیں ہے" دہرا دہرا کر غائب  
 کے علم الغذا پر کچھ اس انداز سے روشنی ڈال رہے ہیں کہ میرے من کا فرائد حلق  
 میں جانے سے انکار کر بیٹھا ہے۔ میں دفتر جانے کے لیے سائیکل نکال رہا  
 ہوں اور... غائب کا فلسفہ فریاد بیان کر رہے ہیں۔ میں سائیکل پر بیٹھ  
 چکا ہوں اور وہ شام کو دفتر سے یہی واپسی پر غائب اور ضبط توبید کے  
 موضوع پر اپنے تازہ ترین الہامات کو مجھ پر نازل کرنے کی دھمکیاں دے  
 رہے ہیں۔

شام کو ظہور پذیر ہوتے تو غائب اور دوسرے شعراء کا موازنہ شروع فرما  
 دیتے اور غائب کے من گھنے والے دیگر تمام شعراء کو قابل گردن زدانی قرار دے  
 کر بھی جب تسلی نہ ہوتی تو غائب کے مختلف شارحین کا پہلے سرکس پیر کشنی شروع  
 کر دیتے اور کافی دیر بعد جب ہر شارح کافی پست ہو چکتا تو خود بھی  
 اکھاڑے میں کود پڑتے اور فریاد فرما ہر شارح کو کچھاڑتے اور پھر ہر شعر  
 کے متعلق اپنی ایک انوکھی، اچھوتی اور عجیب روزگار شروع کا آغاز کر دیتے جس  
 کا انہام غائب اس وقت تک نہ ہوتا جب تک میں اپنے ہر شاعر و محاسن کی قید و بند  
 سے نہات پا کر وہاں نہ پہنچ جاتا تھاں سے خود مجھ کو میری خبر نہ آتی، یعنی بالکل ہی  
 بے سدھ ہو کر اپنے بستر پر گر جاتا۔

میں اکثر خواب میں دیکھتا کہ حضرت غائب اپنا دلیان منہل میں دبائے بیٹھا تھا

چہنئے ہوئے سجا کر رہے ہیں، بھادڑا، بھادڑا! مجھے میرے شرمین اور ماہرین سے بھادڑا! اور ان کے پیچھے شرمین، ماہرین اور پرستاروں کا ایک غول بیا بانی ان کا تعاقب کر رہا ہے جس کی قیادت ایک ٹونڈا ایسے میرے محلے کے باہر غالیات کر رہے ہیں اور اپنے ساتھ مجھے بھی ایک زنجیر میں بانڈھے گھسیٹ رہے ہیں۔

کئی مرتبہ تکلف برطرف کر کے منت سماجت کی، ساتھ جھڑپے، دازھی میں ہاتھ دیا، کان پچھا کر اٹھا بیٹھا اور حرف مطلب میں زبان پر لایا کہ اسے مانتا ہوں آپ کو آپ کے حضرت غالب مبارک! مجھ کو صواب تو ہے یہی حال ہے جو ہر دیکھنے والا آپ کی غالیات میں کون سا بنا لگ جائے گا۔ میں اب نہ کہتا ہوں احمق، جاہل اور پیچیدہ ہوں۔ میرے ایسے فورہ ناہیز کو غالب ایسے آفتاب عاتق سے کیا نسبت! میں حضرت غالب کا صرف اس قدر گنہگار ہوں کہ عالم غالیات میں ایک مروجی صاحب نے اصول میں نویں کی کتاب سے انکی چند غزلیں لے کر ستر پڑھائی تھیں کہ عہدِ محمد سے آج کے سچے سچے ہیں انہیں اتنا بھی نکلا، ہر اور لکھا بھی خاک و تہ۔ ہرگز ان تو مٹانے نہ بنے، غالیات کو میں کیا میری سات ایشیاں ہی نہیں منجھو نکھیں۔ میں مراضیں سمجھا ہوں نہ سمجھنے کی اہلیت نہ کونساں۔ آپ میرا میرے ہوش و حواس پر چاند بازی گویا بجز زمین پر توڑ کر میری مرنے والی مرنے والے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ میں پاگل جو جاؤں گا اور میرے بیوی اور بچے آپ کو اور مرنے غالیات کو کہتے پھریں گے۔

لیکن اب غالیات، صبا کب ماننے والے تھے، میرے اندر بے پناہی سے ان کی سہروانی میں اور بھی چار چاند لگ جاتے اور غزل و گلست سے ان کے غنچے کی بگلیں پتے سے بھی غبار و چوہ۔ لیکن گنتیں۔ ہر گاہ کوئی ایسا بھی ہو غالیات کو

نہ جانے؟ وہ سے اور دل ان کو جزو سے مجھ کو زبان اور لپ غائب کو غلط کہے ہیں !  
 اے درینا دور نہ شاہد باز ! ” اور یہ جڑانے کے بعد وہ غائب کے متعلق اپنی تحقیق  
 اور دریافت کی گور باری مجھ پر کچھ اور تیز کر دیتے ۔ مجھے کہی اگر دنگت یا حساس اختر  
 دیکھتے تو چمکنے کے لیے مجھ پر وہ چار انتہائی زلزلہ خیز سوالات مانع دیتے  
 ” غائب کے نظریہ فلکیات کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے اور اس کے  
 ماتحت امر غائب کے ساتھ دوست قضا نے کیا ہوتا دیکھا تھا ؟ ” غائب نے  
 قدرتی مائع سے جو نفیاتی روشنگاریاں کی ہیں اس سے ان کے تحت الشعور کی  
 کس جلدی کا پتہ چلتا ہے ؟ ” غائب کے سماجی شعور میں سیاسی اور اقتصادی  
 برجست کب اور کیسے پیدا ہوئی ؟ ” وغیرہ وغیرہ ۔ میں یہاں ان سوالات کا  
 جواب کیا دیتا ؟ میں جبراً ماہر غائبیات کی طائیت قلب کے لیے آنکھیں مچاؤ کر  
 منہ اکول دیتا اور ان کی خواہش کے مطابق انہیں اپنے حیرت مند ہونے کا پورا  
 پورا یقین دلادیتا لیکن دل ہی دل میں سوچتا کہ اگر میں اپنی سماجی برجست کو کام میں  
 لاتے ہوئے اپنا دینی قدان ماہر غائبیات کے تحت الشعور پر پوری قوت سے  
 پہنچا دوں تو یقیناً ان پر فلکیات کے بہت سے طبعی روشن ہو جائیں گے ۔  
 بس کیا عرض کیا جائے کہ کس طرح عاجز اور پریشان کر رکھا تھا ان ماہر  
 غائبیات نے؟ ان سے جان چمچا نے کہ یہ بیسویں ترکیبیں کیں ۔ محلے کے  
 با اثر لوگوں کا دباؤ ڈلوایا ۔ گنہم غلطو کھے ۔ ایک انپکرو پریس سے ان کے خلاف  
 کوئی فرضی مقدمہ چلانے کی فرمائش کی ۔ بیماری کا ڈسٹنگ بنایا ۔ ہرے بے  
 (قرائنات دونا ہو گیا) دوستوں کے گھر جا کر پناہ لی ، گھر کے دروازے بند کر لئے  
 نوکر کو ہدایت کی کہ ” ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے ! ” لیکن اچی ترجمہ کیجئے ۔ حق ۔ اہل  
 تدبیر کی دماندگیوں پر ماہر غائبیات مجھے نہایت تو گھنٹوں غامت کا کوئی شعر اور اس

مے متعلق ایک نئی داستان پر مشرب اپنے اوپر جاری کیے ہوئے میرے دروازے کے سامنے ٹھل میں شلہ کرتے اور جب تک لمبے گھر سے نکلنے گزرتا کر کے ٹوہ پر یہ شعر صادق نہ کر دیتے دم ہی نہ دیتے تھے۔

مجاگے تھے ہم بہت سراسمی کی سزا ہے یہ  
جو کر اسیر دلتے ہیں دلہزن کے پاؤں

ان حالات میں اسے چاہے میری بدوائی کہیں چاہے اقدام قتل سے گریز کر  
جیسے ہی مجھے ایک دوسرا مکان ملا جو اگرچہ میرے پہلے مکان کا صرف نصف بہت معلوم  
ہوتا میں ریاں توڑ کر بھاگا۔ ماہر خالیاات سے میں نے کہہ دیا کہ میں شہر کی صورت چھوڑ  
رہا ہوں اور وہ مجھے آبدیدہ ہو کر رخصت کرنے آئے تو بڑے رقت انگیز لمبے میں فرمایا  
”آپ غائب کو غلط سمجھے ہیں۔“ اور اگر میں ”شہر تم کو سگر نہیں آتی۔“ نہ چھوڑا اور فعلی  
سے تانگے والا اس کا مخاطب اپنے آپ کو سمجھ کر فوراً ناٹھ کر ایک نہ دینا تو یقیناً ہر  
خالیاات مجھے ایک فی البدیہہ اور دائمی حجاب دیے بغیر گزر نہ مانتے!

اپنے ان جان لیوا ہر خالیاات سے چھٹکارا پا کر مجھے جو مسرت ہے پانیاں حاصل  
ہوئی اس کا اظہار غالباً بغیر ضروری ہے۔ ج  
مژدہ ملے مرغ کہ گلزار میں صبا نہ نہیں!

مکان تبدیل کرنے کے مسئلے میں اپنا ایک مکان سے انتہائی بدعاسی اور سرکشی  
سے باندھا ہوا سامان جب دوسرے مکان میں کھولا جاتا ہے تو کہیں سے موٹ کر  
لانے جوئے مال فنیست کا طوف آجاتا ہے اور اس میں سے ایسے ایسے حیرت انگیز  
انگشتات نمودار ہونے لگتے ہیں کہ ناطقہ سرسبز یہاں ہو کر رہ جاتا ہے۔ میرا وہ آئینہ  
جس کو میں نے یقیناً کسی بہت محضرتا جگر بڑھی احتیاط سے چھپا دیا تھا کہ بند رہے

اور ذاتِ مزدورت پر کام آئے، انتخابِ تماش اور سبتر کے بعد سچی بات نہیں کہتا لیکن نگار کارہ جوتا جس کے متعلق یقین کامل تھا کہ وہ جیسے ہوئے، کھوپکا ہے۔ چنانچہ اس کے جوڑی دار کو میں نے چلتے چلتے ماہر غائبیات کے مکان کی طرف اپیل دیا تھا ایک ڈبے سے بے ساختہ نکل پڑتا ہے۔ میں اپنے سامان سے کشتی رو رو کر اس قسم کے حادثے سے دوچار تھا کہ افتا کسی نے باہر کا دروازہ بہرہ بھرانا شروع کر دیا۔ مجھے اس وقت سچ پچھنے تو بلکہ الموت تک سے بچنے کی فرصت نہ تھی لیکن طوفانِ کرب لا حول پڑتا ہوا چکا اور دروازہ کھول دیا۔

واٹس می چڑھائے اور صوفِ بیدان اور تھکنا ایک بزرگ نمودار جوئے اور بڑی بے تکلفی سے ”سلام علیکم“ کہتے ہوئے، جھکے میں داخل ہو کر ایک کرسی گھسیٹی اور اس پر کڑوں جیوٹ گئے اور کچھ صوم کر پھر پڑھا ”ہم بکاریں اور کیلے، یوں کون جائے؟“ بار کا دروازہ پائیں گر گئے!

مجھے مجبوراً ”وعلیکم السلام“ کہہ کر ایک منڈھے پر چناہ لینا پڑی۔

”اس مکان کے نئے گرانے دار آپ ہی ہیں! جھکولی دیرانی سی دیرانی چٹا مطلب یہ کہ آج آؤے مذکورہ پندرہ ٹنڈا مکان ہے!“

مرزا غائب کا تاثر تو کلامِ ٹھننے کے بعد اور غصے کے غن سے میرے کان خود بڑا بھنے گئے اور بڑی مشکل سے میرے منہ سے فقط ایک ”جی“ نکل سکی۔

”ابھی ابھی مرزا کہیں صاحب سے معلوم ہوا کہ یہاں تشریف لائے سے قبل

آپ دہلی میں رہتے تھے۔ یہ کیوں دہلی میں ہر اک نامی چیز ڈال کر ہے؟“

”جی ہاں دو تین ماہ دہلی میں رہا ہوں۔ کیا میرے غلات خضیر پوریس کی کوئی سستی آپ کے سپرد ہوئی ہے؟“

”کرا کر چیخ اٹھے“ ہے ہے خدا نخواستہ وہ اور دشمنی۔ اے شوقِ منفعل یہ

تجربہ کیا خیال ہے۔“

میں نے ہمت کر کے دہلی زبان سے عرض کیا ”آپ نے ابھی تک مجھے فرماتے  
آپ سے متعارف ہونے کا شرف نہیں بخشا۔“  
اپنے سر کے بال فرچتے ہوئے بولے ”پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے۔ کوئی  
بتلاؤ کہ ہم بتا نہیں کیا!“

اب میری ہر جاسی مشکل ہو چکی تھی ”جی۔ آپ! حضرت غالب!“  
”جی ہاں حضرت غالب! ج۔ ہم ہمیشہ وہم مشرب وہم ملا ہے میرا۔ جی اس  
وقت صرف یہ پوچھنے کا مزہ ہوا تھا کہ آپ دہلی میں سب سے جی ترشٹا و اعلیم سن  
حضرت غالب سے تو ضرور ہی واقف ہوں گے۔“

مجھے بھر پوری کمی محسوس ہونے لگی اور میں نے بڑی بے اعتنائی سے جواب دیا۔  
”جی ہاں سنا ہے کہ اس نام کے ایک بزرگ کا مزار دہلی ہی میں ہے۔“

اپنا سر ہٹتے ہوئے بولے ”صاف کیجئے گا آپ نے بھی بے رحمی کی حد کر دی!  
سنا ہے کہ اس نام کے ایک بزرگ کا مزار دہلی ہی میں ہے۔ ج۔ جلوہ گلی کے سوگند  
اپنے دفن میں نہیں۔ ابھی آپ کو یہ کبھی ترفیق نہیں ہوئی کہ آپ اس بارگاہِ خاکِ مرثیہ  
پر حلا۔ رجب میں ہمدردانہ سے کم تر نہیں ہوں میں۔ سر عقیدتِ حکم کے کم سے کم شرف  
قدم ہر کسی کو حاصل ہی کر لیتے۔ وہی مثل بارہ برس دہلی میں رہے اور ج۔ سر جانے  
رہے مزار ہی کے بغیر۔ سہاڑ ہی محسوس کیجئے رہے!“

میں نے بھی کچھ اس پہلا ہٹ سے جواب دیا جیسے اگر میرا پس چلتا تو غالب کو ان  
کی خواہش کے مطابق غرق کر دیا، سو جانے دیتا اور کچھ نہیں تو دہلی میں تو ان کا مزار ہرگز  
بننے نہ دیتا۔ میں مزار پر حاضر بھی ہوتا تو مروجِ توفیق کے اندر تھے ذکر اور پر ہی شرف قدم  
ہر کسی کیسے حاصل کر لیتا!“



کلیئر پوکر کر رہے تھے۔ ”ہے ہے اچھا کہتا ہے منہ سے کھینچ کر باہر لگن کے پاؤں۔  
اجی آپ کو کیا خبر ہے پس اذمروں بھی دلیانہ زیارت گام غفلت ہے۔ شرارت گ نے  
قربت پر میری گفتگو کی!“

میں خاموش رہا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد پھر گویا ہوئے ”کم سے کم اذمرو  
تقریر آپ کو مرحوم کے میری بچوں کے پاس تو چلا ہی جانا چاہیے ستاج۔ بچوں کا بھی  
دیکھا نہ تھا کوئی دن اور“

”اب کسی روز آپ کو ساتھ لے کر چلا جائی گا۔“

میرے جواب کو سنا ان سنا کر کے اچانک بڑبڑائے اور میری کتابوں کے گڑ  
پر جو بھی میز پر پڑی تھیں قریبی سے دیکھا ہوا تھا جیسے اور سب سے ادھر کی کتاب  
جو اتفاق سے دیوان غائب تھی اس کا کہ ”جوش بہار جہود“ چنے ہوئے ہوئے ”یہ سمیٹ  
آپ کو کہاں سے دستیاب ہوا چاہا اگر نادر اک دیوان بے شیرازہ تھا۔ مدت کے بعد  
آج ایک مسلم دیوان غائب ہوا آیا ہے جو کسی طرح بھی مجھے مرغ مسلم سے کم عزیز نہیں  
تھا کہتے ہیں کہ غائب کا ہے انداز بیان اور“

”بازار سے“

”بازار سے؟“ اور بازار سے لے آئے اگر ٹٹ گیا دیکھا بازار میں اس قسم کا  
بھی کلام بچتا ہے؟ خدا سمجھو نہ بلوئے تو سترہ اٹھارہ سال جسے میرے پاس  
جس ایک مسلم دیوان غائب تھا جو میرے ایک رشتے کے نام میرے گھر پر بھول گئے  
تھے۔ چاہے کہیں فراک میں تیرے کوئی ٹیچر بھی تھا لیکن خوش قسمتی سے ایک روز  
بہنودار میں کدو اور جواگ چلانے بیٹھیں۔ چاہے کہ لگائے نہ لگے اور بچائے نہ بنے تو  
اس صبیحہ نوزی کو کچھ اس طرح چھڑا کر کہیں۔ ج۔ دل سے تری نگاہ جگڑک اٹھ گئی۔  
یعنی دیوان کا قریب قریب ہر مصرع الٹی اپنے مصرع ثانی سے جدا ہو گیا۔ وہ تو کہیے کہ قہر

میری نظر پر لگتی فتنہ۔ ج۔ آگ۔ اس گھر میں لگی ایسی کڑھوتا جل گیا، کامضمون ورمیش  
آجاتا۔ کیوں صاحب یہ غلط خوش قسمتی پر آپ چوٹ لگے کیوں، جی ہاں۔ ج۔ اس میں  
کچھ شبہ نہ ہوئی تقدیر بھی تھا۔

میں نے اپنا پیٹ پکڑتے اور نہ بناتے ہوئے عرض کیا: اس وقت پیٹ  
میں کچھ درد ہو رہا ہے۔ اگرچہ شکوہ آپ کسی دوسرے وقت کے لیے ملوثی کر دیں۔۔۔۔۔“  
نادر شاہی حکم دیا: ”اے مرگ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے۔ میں اچھا نہ ہوا برا نہ ہوا“

جی ہاں تو یہی عرض کر رہا تھا کہ اب جو والدہ محترمہ مطلب یہ کہ جن کی والدہ محترمہ  
ان اوراق پر پیش کر جو کسی عاشق کا گریباں ہو چکے تھے جو نے بیٹھیں تو ان کو کچھ ایسا  
جڑ گیا کہ فن غائبیات میں ایک نئے دور کا آغاز بلکہ اضافہ ہو گیا اور جس پر ناہنجیز  
اپنی عمر عزیز کے بارہ سال صرف کر چکا ہے اور اب بہت جلد ویران غائب حسب  
ترتیب اپنے منظر عام پر جلوہ افروز ہو کر رشتہ فانی غائب اور تقدیر شاہان باغ کے لیے جنت  
نگاہ اور فردوس گردش بننے والا ہے۔ محض مصرعوں کی صورتی سی الٹ پلٹ سے کلام  
کی لطافت، غزالت اور صداقت نہیں معلوم کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے اور یقیناً  
اب مرزا غائب کو یہ فرمانے کا۔ ج۔ ”تو سہی گھر سے اشعار میں معنی نہ سہی۔ کوئی سہی  
باقی نہیں رہتا ہے۔ کاش کہ وہ خود اس کو دیکھتے تو محض محض کر کے کھنڈ انوس ملے  
کہ لے خود مجھے یہ کیوں نہ سوجھی اور بلا ادا و آتی میں نے یہ پہلی کیوں نہ بوجھی۔“

سلسلہ کلام یک طرفہ کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا۔ ”تو نے کے طہر پر صرف چند  
اشعار طالعہ ہوں۔ دیکھئے کس طرح دریا کو گڑے میں بند کر دیا ہے؟ ایک رسد  
مجنوں اسکل سے دوتا ہوا مرا تو اس نے اپنے گار جین مرزا غائب سے شکایت کی  
کہ اس کو اسرے نے بے قصور مارا ہے۔ مرزا غائب کا افراسیابی خون جوش میں آگیا  
اور وہ ماسٹر کے سپردے اڑانے“ اسکل پہنچے تو میں موقع واردات پر شاعر مل

تھا اور انہیں سمجھتا ہے کہ اسٹریٹ پر خردوار مجنوں کو جو سزا دی وہ بالکل حق بہانہ ہی  
 کیونکہ یہ صاحبزادے کوٹے سے اسکول کی دیوار خراب کرتے ہوئے پکڑے گئے تھے  
 بے ذنن نامیچ سے غائب کیا ہوا اگر اس نے شدت کی۔ کہ مجنوں کو ہم الفت کہتا تھا  
 دیوار دہشتاں پر۔ خدا خدا لگتی کیئے گا کباب شعر کی اخلاقی تیشیت کہاں سے کہاں  
 پہنچ گئی ہے؟ عاشق کی عزت نفس کے متعلق غائب نے بہت سے اشارے کیے  
 ہیں لیکن خدا اس شعر کے تیرہ ملا حلقہ فرمائیے۔ ایک دفتر میں ٹھکرک ہو جانے کے  
 بعد عاشق کے لہجہ میں کیسی خدا اعتمادی آجاتی ہے؟

دام پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں نہیں  
 وہ دن گئے کہ کہتے تھے ٹھکر نہیں ہوں نہیں  
 ملا حلقہ جو کہ قرض کی مشرب پی کر مرزا غائب سالی کی دھڑلے سے بچنے کے  
 لیے اس کو کسی طرح کا بچکارا دیتے ہیں

قرض کی پتے پتے تھے مئے اور کہتے تھے کہ ہاں  
 وصول دھپا اٹس سراپا ناز کا شیدہ نہیں  
 کون کہتا ہے کہ مرزا صاحب ناما قبت انفریش تھے۔ دیکھئے کس طرح اپنے چہرے  
 یہاں استاد کو مشورہ لینے کے بہانے نصیحت کرتے ہیں  
 بے توں سوتے ہیں اس کے پاؤں کا بوسہ ملے  
 فائدہ کیا سوچ آخر تو بھی دانا ہے استاد

اور غائب یہ آپ کے مذاق کا شعر ہے۔ خدا معشوق کی جلد بازی تو ملا حلقہ بڑے  
 ذہن سے بڑا کر نقاب اس شعر کے منہ پر رکھا  
 جتنے عرصے میں سراپٹ ہوا بستر نکلا  
 مرزا معشوق کی تیز رفتاری تو غائب اس سے بہتر کبھی بیان ہی نہیں کی جا سکتی

خدا سے وہ غیرت صرصر کھلا  
کس نے کھولا۔ کب کھلا۔ کیونکر کھلا !

اور غائبانہ شہرِ قرداد سے مستثنیٰ ہے۔ ساقی اس سے بڑھ کر مرزا صاحب  
پر اور احسان ہی کیا کر سکتا تھا۔

میں اور خطِ وصل خدا ساز بات ہے  
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہر شراب میں

اور پھر معشوق کے بڑھاپے کی جب وہ کئی بچوں کی ماں بن کر اپنے شوہر سنی غائب  
کے پرانے رقیب کے ساتھ 'سب غیرت ہے' قسم کی زندگی بسر کر رہی ہے کیا  
خوب تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے۔

یقین ہے ہم کو بھی لیکن اب اُس میں دم کیا ہے  
رقیب پر ہے اگر لطف، تو ستم کیا ہے؟

دیکھئے چاہئے۔ ظلم ہے گردِ دوسمن کی داد! یہ سب مصرعے حضرت غالبؒ کی  
کے ہیں اور میں نے ان میں کسی قسم کی کوئی تحریف نہیں کی ہے صرف نورِ چابکدستی  
سے ان کی ترتیب میں تھوڑی سی اسٹ پلٹ کر دی ہے۔

میں نقشِ حیرت بنا یہ سب سن رہا تھا لیکن نہیں معلوم میرے ہاتھوں میں ایک  
خاص قسم کی تشفی کیفیت کیوں پیدا ہو رہی تھی۔

باتِ صاحب کی روانی طبع کچھ اور تیز ہو چلی۔ دیکھئے مرزا صاحب معشوق کو بہل  
سہلہ کرائے چپ کر ملنے کے کیسے کیسے مقامات بتاتے ہیں! اگر گباراں دیدہ  
تھے کہ باتیں۔

مجھ کو بھی پوچھتے رہو ترکیبِ گناہ ہو  
مسجد ہو، مدرسوہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

اور جگر ختم کر دیا یہ شعر تو طالع فرمائیے۔ ج۔ دل صاحب اولاد سے انصاف طلب ہے۔ آپ نے بہت سے معشوق دیکھے ہوں گے لیکن ایسا عاشق مار معشوق بھی کہیں آپ کے پلے پڑا ہے؟

اُن کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر ردفی  
 جی میں کہتے ہیں کہ "مفت آئے تو مال اچھا ہے"  
 اور یہ شعر تو حاصل دیوان ہو کر رہ گیا ہے۔ پہلے شعر سن لیجئے پھر میں اس کے  
 تفصیلات اور تفصیل سے بیان کرنا چاہتا ہوں۔  
 پھر سے رات کیا بنی جو کس تو دیکھئے  
 صبح محیط آب میں ماسے ہے دست دپاکریں

اس کے بعد کیا ہوا؟ تفصیلات بہت اُن ایک قصہ اور ایک بنیان کی کچھ دہیں  
 میرے حصے میں آئیں اور میرا رفیق دیوان غالب مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بکھر گیا۔  
 ان احوال میں اسپتال میں ہوں اور بیوی بچے ہوٹل میں "اسٹنٹ آفیسر" کو درخواست دے  
 رکھی ہے کہ مجھے کوئی ایسا مکان لائے کہ جس میں چاہے دو ٹنڈان۔ نامہ دان بلکہ  
 چھتیں اور دیواریں تک نہ ہوں بلکہ اس سے ایک میل کے قطر میں کوئی ماہر غائبانہ  
 نہ پایا جاتا ہو۔ ابھی تک ایک بھی ایسا کوئی مکان مل نہیں پایا ہے۔

راجع رہے کہ غالب اب بھی میرا محبوب ترین شاعر ہے بلکہ ماہرین ادب و شاعری  
 کے دستوں اس کی درگت بنتے دیکھ کر وہ مجھے پہلے سے بھی کہیں زیادہ عزیز ہو گیا ہے  
 بھروسہ نہیں نے دیوان غالب کا ایک دوسرا نسخہ طریدہ پاس ہے اور غسل خانے میں  
 جب بھی پانی مندرت سے زیادہ ٹھنڈا ہوتا ہے تو میں اس کے اور صرف اس کے  
 اشعار گنتا ہوں اور اکثر اس کی منظومیت کا تصور کر کے یہ مصرع بھی پڑھتا ہوں

شاعر تو وہ اچھا ہے پر بدنام بہت ہے

وجہ بہت علی سندیری



زندگی پر مٹی گزری جاتی کیوں تھرا راہ گزریا آ! (غالب)

## مرزا غالب کا خط پنڈت نہرو کے نام

جان غالب - میں تو قومی صلیح کے طالب ، میں جو ہر لال خوش فکر و خوش خصال  
 جگ-جگ جو ، اقیامت آج حیات پر ہے ۔ سو صاحب ! امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد  
 آئے ہیں ، اور اپنے ہمراہ دو فیسے دیوان غالب کے لائے ہیں ، جو مجھے ابھی موصول ہوئے  
 ہیں ۔ ایک فسخ علی سرمد جعفری نے قریب دیا ہے ۔ دوسرا وحشی رام پوری نے مرتب کیا  
 ہے ۔ دونوں نے اخلاص و محبت کا حق ادا کیا ہے ۔ میر محمدی اور پنڈت کیسی بیٹہ ہیں ۔ تہ  
 کے کش چل رہے ہیں ، ہجر و فراق کے لمحات ٹل رہے ہیں ۔ نغمات و صواں چمک رہے  
 ہیں اور پچپان منک رہا ہے کہلوں میں آتش نشانی ہے ۔ جس سے چم کا چہرہ اور طانی ہے  
 ریشہ کا جب ذکر کیا تو مولانا آزاد نے بتایا کہ میں زبان کے مسئلہ میں تقریر کر آیا ہوں اور  
 مساعلات ہندو کے سپرد کر آیا ہوں ۔ وہ سیاست کے مرمو میدان میں علم و ادب کے  
 پاسان و نگہبان ہیں ، اُنہو ہندی کے مسئلہ میں ایک طالب دو جان ہیں ۔ اب حسب مزاج  
 دونوں کر جگہیں ملیں گی اور دونوں ہی صوبہ میں چلیں گی ۔ سننا ہوں کہ جس ملک کا نام تم نے  
 کلاش دانی رکھا ہے اس نے آنا کی تقریر کو دغز اڑا دیا ہے ۔ اسی کا سا لگا  
 رکھا ہے نہ جانتے ہیں نہ سناتے ہیں نئی فریادیں بنائے سچ میں رکھے ہیں ۔ تم تو زور  
 باتیں بہ علم و ادب کی مرعشاں تحریر ہو ۔ خود روشنی ضمیر ہو ۔ پرچھو فکر وہ ٹال کی چیز چلی ۔ میں

یہیے ڈالی گئی اور زاد کی ساگرہ کی تقریب اس سے کیوں خالی گئی۔ ہولنا کہتے ہیں کہ  
 دن کی تقریر کی تائید تم نے کی تھی اور اپنی رائے ان کے حق میں دی تھی آخر وہ دونوں  
 تقریریں ہوا میں کس گم ہو گئیں۔ میں نے حضرت سلیمان علیہ السلام سے کہلوایا ہے کہ  
 انہیں تھکائیں اور اکاش میں پتہ لگائیں کہ کس جہاں میں ملتی ہیں۔ تحقیق جاری ہے  
 مگر عقل جاری ہے کہ وہ گئیں کدھر۔ خدا بصر تو نہیں ہو گئیں؟

کل جبرائیل امین آئے تھے اور ایک نئی چیز لائے تھے، کہتے تھے کہ جو لوگ عالم  
 ارواح میں آ رہے ہیں وہ سب خطا دار اور دوک عالم ہندو کی لارہے ہیں۔ وہ  
 پرمپی قربت یا قربت یا کر زمین دامن پر اب زبان بار ہے اس کے لب دامن سے کثرت  
 بیزار ہے۔ ہندوستانی تمام اس کے متعلق نہیں کہ عرش کی چیز فرشتہ پر دیکھیں اور اس  
 پر خاموشی اور سکوت کیمنیں۔ جو زبان من و تو کی تکلیفیں باقی نہ رکھے اسے کیونکر سے  
 کرنی بیٹھنے سے لگائے رکھے۔ جب ساری خلقت کی زبان ایک ہو گئی تو محمود ایاں کی  
 شخصیں کس رہی؟ ایک نے لگ دو سرے کی بات سمجھ لی تو تھر تھر کرنے دامن کی  
 فیس کو حرکت دی؟ جبرائیل امین نے یہ بھی بتایا ہے کہ ہندوستان میں یہ کام تیزی سے ہو  
 رہا ہے بلکہ کوئی خفیہ ماسا ہ ہندو عالم ارواح میں ہوا ہے جس کی حقیقت سامیان اردو  
 پر کھل گئی ہے اور انہیں اس کی سن گن مل گئی ہے اسی سے ہندوستان بے عالم بالا  
 جانے دامن کا آنا ہندو سا ہوا ہے۔ ایک کے، چھپے ایک لگا ہوا ہے۔ تقسیم کے بعد  
 بڑے بڑوں میں حسرت۔ سبیل۔ بے خود۔ یگانہ۔ صحتی۔ جہاز۔ کیتی اور کھوپڑی  
 چکے ہیں اور اب جو کانے دے جی وہ بھی پام رکاب ہیں اور سفر آخرت کو بے تاب  
 ہیں، پاسپورٹ بنوا رہے ہیں اور اپنا پور پر بستر بند ہوا ہے ہیں۔ دینا فرما ہی مل جاتا  
 ہے۔ دفتر میں چون و چرا کوئی نہیں کہتا ہے کہ جو جاتا ہے ہٹ کر نہیں آتا ہے۔ مردانہ  
 آزاد کے بعد ایک بزرگ کو مردہ سے بجا لگتا ہے اور مجھو دیگر کاموں کے انہیں اس کام



پر مسم کیا گیا ہے۔ وہ آدمی کیسے ہیں جس صوبہ سے کئے ہیں یہ کام جس دفتری زبان پہلے  
 ہیں۔ ان کے آنے پر صوبوں کو حکم ہوتا ہے کہ کام تیزی سے کیا جائے ورنہ سستی برتنے  
 والوں کو نقد زنداں کیا جائے دفاتر میں جملے والے دل جمعی سے کام کر رہے ہیں۔  
 اور بڑے اور چھوٹے سب ہی نام کر رہے ہیں۔ نئے الفاظ و مصل رہے ہیں اور  
 اصطلاحات کے سوتے ابل رہے ہیں۔ جو بات کہے ہیں اپنے پاسپرٹ اور دینا پانچکے  
 ہیں۔ جن کا دینا تیار ہے ان کا مرکز کراٹھا رہے۔ نئی آزادی کے ساتھ پُرانی زبان  
 و ہر آکر خراب میں ٹاٹ کا گلن نہ ہو۔

پاکستان میں بنگالی اور پنجابی واسے جھگڑا کر رہے ہیں اور سندھ والے سندھی  
 کے لیے اکر رہے ہیں۔ وہ بھی نئی آزادی کے ساتھ نئی اصطلاحات کے طالب  
 ہیں۔ مسگرہاں کی اصطلاحات بدھوں کی زبان کے عادات غالب ہیں۔ جبکہ عربی  
 طاسکھ کی زبان ہے اور عربی رسم الخط پر فرشتوں کا ایلان ہے تو اسے عالم اداغ میں  
 کیوں نہ پہنایا جائے اور اسے بدعائیت کا ہمار کیوں نہ پہنایا جائے۔ ہندوستان  
 کے صوبوں میں کام مشکل ہو چکا ہے و صاحب بدل چکا ہے۔ اور انجمن ترقی اردو اور  
 قمبر اردو سوڈے اٹکا رہی ہے اور اس کی بنگال خاطر دھکے کھا رہی ہیں۔ ان میں سے  
 ایک کو جس نے فوراً زیادہ دست برداؤں نکالے تھے اور زمین پکڑنے کے نئے گوشے  
 نکالے تھے اسے و غلیظ دیا گیا تھا اور اس کا منہ بند کیا گیا تھا۔ مسگر وہ اب بھی رڑ  
 کیے جاتی ہے اور اپنی بساط بھر رڑے جاتی رہے۔ اس کی ٹوکوں رو کے اور اسے کون  
 ٹوکے کراسی میں چید کرتی ہے جس میں کھاتی ہے اور جس کے پیسے کے بل بوتے مشاعرے  
 کراتی ہے۔ میں نے اندازہ دل لگی جبرائیل امین سے پوچھا کہ یہ اثر پرودیش سے کیوں نکال  
 گئی۔ کس جرم میں اس پر کل ڈال گئی؟ اے صاحب جس زبان کی کھانی پرورد سے  
 بہکھم ہائے اور جو عالم اسراج کی زبان پر عمل در آمد کر داتے وہ اثر پرودیش میں جگہ کیسے

ہائے؟ میں نے ہنس کر پچاس کراہوں کا کیا خیال ہے اور ان کا کیا حوالہ ہے! بولے۔  
 مشاعروں میں فخر بازی ہوتی ہے۔ داد داد کی آتش بازی مچھلتی ہے۔ مصرعوں  
 کو زور زور سے اٹھایا۔ سبحان اللہ کا ایک طغیان مچایا جاتا ہے۔ اس دھیس کا  
 ایک خاص مزاج ہے۔ یہاں صلح و عاشقی کا راج ہے۔ یہاں کے لوگ ہنساکے  
 قائل ہیں اور مدسکون اور خاموشی کی عزت مانگتے ہیں۔ سکون کے تیر چلپتے ہیں اور  
 مضبوط و شعل سے دلوں کو گرگرتاتے ہیں اور اسی سے بڑے بڑے معرکوں میں دشمنوں  
 کو نیچا دکھاتے ہیں۔ جو زبان یہاں ڈھالی جا رہی اور کروڑوں روپیہ سے ہالی جا  
 رہی ہے اس میں ایک خاص قسم کی انفرادیت ہے۔ خاموشی اس کی خاصیت  
 ہے۔ ہر فرد اپنی زبان کا خالق ہے اور بلا شرکت غیرے مالک ہے۔ خدا اپنی  
 اصطلاحات ڈھالتا ہے اور اپنی رفتار و گفتار کو پاتا ہے۔ چونکہ سر پر خود ساختہ تاج  
 ہے اس لیے کسی کا دست نہر ہے نہ تاج ہے۔ سین میں جب زبان کا شاعر  
 جاتا ہے اپنے کلام سے حلق اٹھاتا ہے۔ جب کلام سُنا ہے تو سائین پر قربان  
 لٹکھاتا ہے۔ نہ کہنے کی خوشی نہ جانے کا غم۔ نہ جھینے کی خوشی نہ مرنے کا الم  
 ہر شعر سکون افزا اور ہر بند خاموشی پر خدا۔ حاضر میں غیر حاضری کا مزہ آتا ہے  
 اور ہر حاضر حزد بخود اپنے کو خاموش پاتا ہے۔ میں نے جبرائیل امین کو ان کے اس  
 تجربے پر داد دی۔ مگر اسی کے ساتھ اس خبر پر ہمارے بارود اور کاکر پھر  
 عالم اور راج میں ایسی زبان کو جھینے میں اتنی دیر کیوں ہے اور یہ آپس میں دشمنی  
 اور جبر کیوں ہے! بولے نہ میر اور غیر کا سوال ہے اور نہ اس کے رہنے اور نہ رہنے  
 میں قیل قیل ہے۔ پانچ سال میں یہ مصیبت ٹل جائے گی، اس وقت تک نئی پور  
 تلخیصی اداروں سے بڑھ کر کھڑے کر لکھ آئے گی۔ نئی زبان میں سنو نہیں گئے اور وہی مقصد  
 زندگ نہیں گئے۔ زبان صرف بول جائے گی۔ اسٹاروں میں قتل جائے گی۔ میں نے

کہا اچھا اچھا سو گیا۔ بات کی تسکیر پہنچ گیا۔ حمید سلطان اور کالی احمد دونوں کو یہ خط دکھا  
 دو اور جن جن کو اس سال بیچ رہے ہوں ان کا نام و پتہ بتا دو۔ نام زیادہ ہوں تو نمبر ہی  
 لکھو اور۔ منکر خط کی رسید بھی بھجوا دو۔

تساری عافیت کا خطاب

اسد اللہ خاں غالب

مصر ۲۷ فروری ۱۹۶۰ء

فرقت کا کردی



## مرزا غالب باسٹل میں

(ذیل میں مرزا غالب کے تین غیر مطبوعہ مکتوبات ہیں جو مسلم یونیورسٹی کے باسٹل ایس ایم ایسٹ سے لکھے گئے ہیں ان خطوط کی تواریخ نامعلوم ہیں۔)

### ۱۔ دوست کے نام

میری جان کن لہرام میں گرفتار ہے۔ جہاں سے بی اسے کامیاب کیا ہے۔ وہیں سے ایم اے بھی کر ڈال ڈال کر کرسی ایک دہم ہے۔ عاجز ہے۔ علی گڑھ آنے کے خیال کو دل سے نکال۔ تجھ کو خدا بیتا رکھے۔ مگر اس راہ میں تیرے حالات و احوالات کو پیش و قریٰ دے۔ یہاں سبوں سے بھی توقع نہیں ہے بروں کا کیا ذکر۔ کچھ بن نہیں آتی۔ آپ اپنا تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و وقت سے خوش رہتا ہوں۔ یعنی میں نے اپنے کو اپنا خیر تصور کیا ہے۔ جو خوشی جبر تک پہنچتا ہے کتابوں کو مرزا غالب کے ایک اور جوتی ملی۔ بہت اثنائاً تھا کہ میں بڑا شاعر امد فاضی داں ہوں۔ آج درد و شک میرا جواب نہیں ہے۔ بے اب قرآن تھا خضر کا جواب دے۔ سچ قریوں ہے کہ غالب علی گڑھ کیا آیا بڑا کتب آیا بڑا امر دہ آیا۔ ہم اندازہ تعلیم جیسا بادشاہوں کو بعد ان کے جنت آرام گاہ و خوش نشین خطاب دیتے ہیں چونکہ یہ اپنے کو شاہ قمر و سخن جانتا تھا مقرر مقرر اور

ادیدہ زاد یہ خطاب تجویز کر رکھا ہے۔

آئیے خیمہ اللہ کو ہمارا ایم۔ اے، ٹی لیٹ اے، ال مل لی۔ ایک فرسٹ واہنے  
 ہاتھ میں ہے جو مفت کا کیا یا پیاملال کر رہا ہے۔ دوسرا دائیں ہاتھ میں سلطنت قیامت نشور  
 سے اس طرح آراستہ ہے کہ سارا نیکیا سکھا، مافظہ سے بصارت کی طرح ناکل ہو  
 جائے۔ میں ان سے پوچھ رہا ہوں اسی حضرت خواب صاحب انزاب صاحب  
 کیسے! اور غاں صاحب آپ سبقت اور لفظ سیالی ہیں۔ یہ کیا بے عزتی ہو رہی ہے۔  
 کچھ تو اگسرا کچھ تو بلو! اہلے کیا۔ بے حیا، بے عزت۔ ہرے سے چاشت سحر  
 ڈانٹک ہل سے ڈنر، فائنٹ سے نان و کباب اور کینٹین سے چائے بے حساب  
 کالج سے یقین اور کتب خانے سے کتب ہائے جدید و قدیم قرض لیے جاتا ہے۔ یہ  
 بھی قرض چاہتا کہاں سے دوں گا؟

غالب

## ۲۔ میر مہدی کے نام

۱۱۱۱۔ میرا بیٹا مہدی آیا۔ آدم بھائی مزاج تو اچھا ہے۔ میٹر۔ مل گڑا۔ کا  
 یہ دارا معلوم ہو مشہور ہے دارا السور ہے جو لطف یہاں ہے وہ کہاں ہے جو رے نے  
 تین سو قدم پہ ایک چٹر ہے کینٹین اس کا نام ہے بے شبہ چٹر چٹر آب حیات کی سوت  
 اس میں مل ہے نیز میں بھی ہے۔ تو بھائی آب حیات عمر بڑھاتا ہے لیکن اتنا  
 شیریں کہاں ہوگا۔

تھارا خدا پسندا۔ تردد و مبث۔ میرا جھوٹا گھر کے قریب اور ڈاکیہ میرا دوست  
 ہے نہ تخلص کی حاجت نہ اسٹل کی۔ بے دوساں خط بھیج دیا کیجئے۔ یہاں کا حال  
 سب طرف حزب بند اور مرغوب ہے۔ اس وقت اس سے زیادہ نہیں



## دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے ؟

مرزا غالب کی ایک مشہور غزل کے سواں کا مل شایہ ناظرین بہاریں کو اور چند  
سواں کے انگشتان میں مدد سے ۔

سوال :- دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے ۔ آخر اس درد کی دوا کیا ہے ۔

جواب :- ہوا ہے خبط اور دوا ہے کام ۔

سوال :- سبز و دلِ کہاں سے آئے ہیں ۔ ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے ۔

جواب :- یہیں سے سریانی ، فنی ، کوئٹہ اور دہشتی چس کر سبز رنگ اختیار کرتا ہے ۔

سہل اس کی بے حیائی کا اشتہار ہیں ۔ سورج کی گرمی اور سندر کی ٹھنکی کے

دوامی ازدواج کی آگاہ گرد اولاد پر کام آ رہا ہے اور ہوا چند مفید چند نہ بری گیسوں

کا پریشاں مجرم ہے ۔ ہار جو ہلکے ہونے کے اپنے بوجھ میں دلی مری جاتی ہے ،

مداصل نہ کہیں آسکتی ہے نہ جاسکتی ہیں ہی نظر نقر کا نہیں ہے ۔

سوال :- یہ پر پی چہرہ رنگ کیسے ہیں ؟

جواب :- ٹانگر کا فیشر صاف بنا دیتا ہے کہ تمہیں جیسے ان کے خون کے اجڑا ہیں

رنگوں میں ، ریشوں میں ، ہڈیوں کی ساخت اور نشست میں باقی ٹوٹوں سے ۔

سر پر فرق نہیں اور ہر بھی کسی طرح جب سب اولاد پر لڑتے ہیں ۔

سوال :- ہم جس شتان اور وہ بیزار - یا النبی یا جبرائیل ہے ؟

یہ بہت ٹیڑھا سوال ہے ۔ مرزا مروجہ دل تو ضرور تھے ۔ خود کہہ گئے ہیں ۔

و یکمید غلب سے گرا لیا کرتی ہے دل پوشیدہ اور کا ذکر کیا تو کیا اس پوشیدہ ملی  
کا اشاء آج کل کی سیاسی کشمکشوں کی طرف متناہ؟ بالکل ممکن ہے کہ پیر و مرشد نے  
یہ سوال انگلستان کی طرف سے ہندوستان کو مخاطب کر کے کیا ہے ۔ اگر یہ

قیاس صحیح ہو تو ممکن ہے کہ درست جواب صرف ایک نقطہ پر پہنچ "عیب"

صاف ظاہر ہے کہ مروجہ نے زیادہ تر سوال اپنے ذہن کے حسب حال

کیے ۔ تو کیا آج کل کے شاعروں کا یہ فرض نہیں کہ وہ بھی ترجمانِ حالات حاضرہ

ہو کر آنے والی پود کے لیے کچھ سوال چھوڑ جائیں ؟ اگلے سوال سب حل ہو چکے ۔

کیونکہ دلِ نادان کا زمانہ گیا ۔ اب تو ہر ترجمانِ مسلمان ، چاہے وہ خود قطعی مسل پر

اپنا حق سمجھتا ہے کہ اسے ضرور دارِ نادر بدارِ حسین بیرونی ملے ۔ ملکہ اسز دلِ نادان کا قائم

آج کل کیا ہے ؟ نمونے کے طور پر اوپر فرض لپکا کرنے کے لیے غالب والی زمین چن

سوال عرض ہیں ۔ ممکن ہے پچاس سال بعد جواب مل جائیں ۔

ذکرِ مسلم تجھے ہوا کیب ہے ؟ گری کی تری ادا کیب ہے ؟

گر سے عازم متا تر سونا کا بیسویں میں یہ گھومت کیا ہے ؟

کا گھنٹی کیب مشین کسے کی مثل منصور کٹ گیا کیب تھا

کانپور کی محاذ و کعبہ کیا جہولاب کا ہی راستہ کیا ہے ؟

ہیرے زلیخہ کساں سے آئے ہیں قوم کیا چیز ہے خدا کیب ہے ؟

خادمِ القوم سے حساب طلب

نہیں جانتا دنیا کیب ہے ؟

نکاح پیرا



## غالب اور تیلین

میر ہمدی ۱۔ مرزا صاحب بھی بہت برہم ہیں۔ فرماتے ہیں کہ ان نا اہلوں کو اب یہیں ہرگز اپنا کلام نہیں سناؤں گا۔ جو شاعرانہ نکات و درجہ سے واقف ہیں نہ علی استعدا رکھتے ہیں۔ غزل میں صرف مسائل ہندی اور چمپلا پاتے ہیں۔

غلاب نیزہ۔ ان کا یہ فرمانا بالکل بجا ہے۔ عام لوگ مرزا صاحب کے کلام کی ایسا ہی کیفیت کو سمجھ نہیں سکتے۔ اس لیے اعتراض کرتے ہیں۔ مرزا ان کے اکثر اشعار قمریوں میں قارئین کے لائق ہیں۔ ایک غزل ولایت خاں نے بھی سنائی تھی۔ مطلق آ گیا۔ کیسی مشکل زمین ہے جس میں اتنے اچھے اچھے شکر کئے ہیں۔

میر ہمدی مجروح ۱۔ بھائی نیزہ! یہ غزل اس وقت سنائیے تو مطلق آ جائے۔  
غلاب صاحب ۱۔ کوئی ہے؟ ولایت خاں کو ابھی بلا لاؤ۔

چند منٹ بعد ولایت خاں حاضر ہو کر سب صاحبوں کو جگہ جگہ کر کے اب بجالاتا ہے۔

غلاب صاحب ۱۔ ہاں، ولایت خاں! مرزا صاحب کی وہ غزل سنناؤ جو کل تم نے سنائی۔

ولایت خاں دست بستہ ہو کر عرض کرتا ہے: بہت بہتر سرکار! اور ستار

کے تارچہ ساز چنڈیٹ میں سرورست کرنے کے بعد سوزِ بھری آواز میں گاتا ہے۔

نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے

کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

عاضدین پر عالم و جدِ طاری ہے۔ سب کیفیت میں ڈوبے ہوئے مجھوم رہے ہیں۔

نضا پر نشہ بن کر غاب کی غزل جہاں ہے۔

ولایتِ خاں دل نشیں لہجے میں کہتا ہے :

ہو جودہ سر سے گرا ہے کو اٹھائے نہ اُٹھے

لام وہ کن پٹا ہے کہ بنائے نہ بنے

میرن صاحب ارغزیر انداز سے، قنقیرِ رنگار، اسے دادِ مرزا صاحب اکیا کہنے ہیں

آپ کے۔ کس قدر بے معنی شکر کیا ہے، لیکن آپ کے حقیقت مند ہیں کہ

اس بے تنگی آپک پر بھی مجھوم رہے ہیں۔ بجلائے بھی کوئی لنگہ ہوا جو مجھوم سے

گرنے کے بعد اٹھا کر سر پر نہیں رکھا جاسکتا وہ پہنے ہی کیسے سر پر آگیا تھا بالکل

نفسولِ شمر ہے۔ میری کجی تو یہ آیا نہیں۔ آپ حضرات سن گے، سخنِ فہم ہیں،

مجھے اس کا مطلب سمجھا دیں۔

غاب تیرا۔ خیر، سمجھا تو ہم میں سے ہر ایک سکتا ہے لیکن اچھا ہے کہ حضرت غاب

سے ہی اس کی تشریح کالی جائے۔

میرِ مدی مجروح۔ میں ابھی پوچھ آتا ہوں۔

غاب۔ نہیں سہائی! آپ بیٹھے۔ اپنے بڑے لڑکے مرزا شباب الدین خاں

ثاقب سے کہتے ہیں۔ شابو سہاں! یادِ مرزا صاحب سے ہم سب کا سلام

دہن کرنا اور میرن صاحب کی جانب سے یہ گزارش کرنا کہ اس شعر کا مطلب

سمجھا دیں۔

ثاقب جاتے ہیں۔ مرزا صاحب اس وقت غفلت میں دینا میں مصروف ہیں۔ ایک جام  
 لہجے ہیں، دوسرا آخر میں ہے، عالم کیفیت دوسروں میں اس غزل کا مطلع گنگا رہے ہیں  
 عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتشِ غالب  
 جو لگائے نہ لگے اور بجائے نہ بنے !

قدوس کی اکہٹ پر چومک کر مرزا صاحب نے آنکھیں کھولیں اور ثاقب کو دیکھ  
 کر محبت جبرے لہجے میں کہا : آؤ بیٹا !

ثاقب نے اکابر کر کے مودانہ، میرن صاحب نے جو کہا تھا، وہ بے لہجے ہیں  
 اور یا۔ مرزا صاحب ہنس کر بولے

تارے، اس کو بس سے کہہ دینا کہ تو فی شعر کو کیا جانے اور روز شعری سے تجھے  
 کیا مطلب — روپے جمع کرنے کے طریقے سیکھ، اتنا دانی کے مزے آئے کی کیا ضرورت  
 ہے اور شعور شاعری سے تیرا کیا واسطہ ہے ؟ ارے بے وقوف ! یوں سمجھ، تیلن تیل پے  
 ہمارا ہی ہے۔ تیل کی جھری ہوئی، مٹکی سر پر رکھی ہے۔ مٹکر گئی پاؤں چھو، تیلن  
 گئی، مٹکی ٹٹ گئی، تیل بہہ گیا۔ اب وہ اس گھر سے جوئے تیل کو سمیٹ کر کچے سر  
 پر رکھے۔ ج

بوجہ وہ سر سے گرا ہے کہ اٹائے نہ اٹھے

حمیدہ سلطان

پہلے سے یہ سب لکھا ہے

## غالب کے ناخن

اگر غالب کے انتقال کر برس پانچ دس برس ہوئے ہوتے تو ان کی خداک ہاں  
دغیرہ کی ایک ایک تفصیل پر کھینے کا سوتو بھی نکل آتا اور اگر عجیبے ذات خدا ان کی  
ذہانت نصیب نہ ہوتی ہوتی تو میں اُن کے کسی نوکر چاکر کو چر دو سکا کے کسی  
چائے خانے میں لے جاتا اور اس سے کچھ اس طرح کے سوال کرتا۔

”فدایہ تو بتائیے کہ مرزا غالب مرحوم کتنے عرصے کے بعد ناخن تراشوا یا کھتے  
تھے؟“

”یہ کام وہ کسی گز سوادہ کار غیلطے کے سپرد کرتے تھے یا کسی نیک بہت کر  
خدمت کا موقع پہنچتے تھے؟“

”آفریں جب اُن کے قویٰ منہل ہو گئے تھے اور ان کا دم آنکھوں میں  
آ کے ابھ گیا تھا تو کیا انہوں نے اپنے بڑھے ہوئے ناخنوں کے بارے میں  
کوئی موصیت کی؟“

”کیا ان کا ترشہ ہر ناخن اس سے ضرور مل جائے گا؟۔ مسادیک فترہ  
نہیں فیض چمن سے بیکار۔“ والے قصیدے میں انہوں نے لکھا تھا۔  
کاٹ کر پھینکیے ناخن تو باز باز ہال

وقت نامیہ اس کو بھی نہ چھوڑے بیکار

معاذِ غلب ہے کہ موسم بہار کا بیان ہے اور وہ بھی اس صورت میں کہ ناخن کو  
کاٹ کے باقاعدہ زمین پہ نہ پھینکا جائے نہ کوئی زیادہ ترشے بہائے ناخنوں  
کو رنگیں کاغذ میں باندھ کر بطور یادگار اپنے پاس رکھے جہاں مرزا غلب کے ناخن  
کی سونے چاندی سے کیا کم قیمت ہوگی؟

مرزا کی عین سونخ حراہیں میری نظر سے گزری ہیں۔ ان میں کسی محقق نے اتنا  
بتانے کی زحمت گوارا نہیں کی ہے کہ وہ خطا کس جام سے جوایا کرتے تھے اور پھر  
دورانے کی سادات اپنے کس خادم کو بھٹا کرتے تھے۔ غائب کے خطوط میں اتنا تو  
معلوم ہے کہ انہیں منہ پر داڑھی سر پہ بال رکھنے کی وضع پسند نہیں تھی۔ اس لیے  
کہتے ہیں ”فقیر نے جس دن داڑھی رکھی اسی دن سر خٹا یا“ مگر یہ کسی مدبر سے  
محقق نہ ہو سکا کہ یا وہ ناخن بھی بڑھاتے تھے یا نہیں۔ پھر یہ ناخن کہاں سے ڈھانے  
کی صورت اختیار تین کی طرح باقاعدہ بڑھائے جاتے تھے یا نہیں۔ کبھی کبھی کسی خارجی  
دباؤ سے انہیں یہ ترخوٹے بھی پڑتے تھے یا نہیں۔ انگوٹھے کے ناخن سے ہلکے  
مستورہ خاکو یا نقش کیسے لگام لیتے ہیں اور اس لیے اس کا بڑھانا ان کے یہاں  
سنت کا مقام رکھتا ہے اور کٹانا، مٹاؤ، تیرے کم اذیت نہیں رکھتا۔ غائب نے  
گدہ پر مردوں کی صحبتیں اٹھانے کے لیے مستوری کیلئے کا تیرہ ڈیکہ متا مگر کچھ گلافی  
سے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ اسادہ تکمیل کو پہنچا بھی یا نہیں۔ البتہ ان کے شغل شر  
گرنے سے ان کے ناخنوں کا چل حاسن کا ساتھ ہے وہ چول حاسن کا ساتھ کیا ہوتا  
ہے۔ اس گدہ کو میرے ناخن اب تک نہیں کھول سکے۔ یہ مادہ ہے یا ہائے  
نفاق کی دوسرہ نگاہی کا ایک نمونہ۔ اس سے فی الحال غرض نہیں مراد صرف اتنی  
ہے کہ کافی گہرائقی ہے، اکم سے کم ہم تک یہ بات مزور پہنچی ہے یا پہنچانی لگتی ہے

رگو مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے پہلے پہل اس اطلاع کو کہاں پڑھا اور بعد میں کہاں کہاں اس کی تصدیق ہوئی، مگر مرزا غالب مرحوم بات کو شراب ٹھاب کمیز کے نشے میں شعر کہتے تھے تو دماغ تحریر نہیں رہتا تھا۔ اس لیے جتنے شعر کہتے جاتے تھے آواز بند میں اُسی قدر گانٹھیں جیتے جاتے تھے اور صبح کو جب باندہ شباز کی سرمستیاں ختم ہو چکی تھیں تو ایک ایک گڑھ کھولتے جاتے تھے اور گزشتہ شب یاد کر کے تسوہ کے دائرے میں لگتے تھے۔ اب اس مرزا غلامی سے ہم پر کچھ حقیقتیں واضح ہوتی ہیں۔ جن سے ان کی شاندار اہمیت کا بڑا انکشاف ملتا ہے۔ صاحبانِ تحقیق کے نفسِ قدیم پر چلتے ہوئے اور طبائے فن کی رہنمائی کے لیے ہم یہ نتائج ضرور نکالتے ہیں:

(۱) اس شخصِ مرزا غلامی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مرزا غالب مرحوم طویل اُزار بند باندھا کرتے تھے۔ ورنہ اس میں اتنی گرمی نہیں ہو سکتی کہ غول کے پانچ سات شعر بھی اس میں ٹھکیں۔

(۲) یہ بھی کہ مرزا غالب ناخن بڑھانے رکھتے تھے ورنہ یہ گرمی آسانی سے نہیں نکل سکتی۔ حکیم حسن خاں کے احوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے شرفازیشی اُزار بند باندھا پسند کرتے تھے (خود حکیم صاحب سرخ فرل کاٹا اُزار استعمال کرتے تھے جو ان کے انگریز لکھے میں سے جھپک لگتا تھا) اور ریشمی اُزار بند کی گرمی اس وقت تک نہیں نکل سکتی جب تک کہ کھولنے والا ناخن مراد نہ ہو۔

(۳) یہ بھی ظاہر ہوتا ہے (اگرچہ اس واقعہ سے یہ صاف ظاہر ہے)۔ مگر کاج کل کا زنا اور اچکل کے قادریں گرام ایسے ہیں کہ جب تک بات کو ظاہر نہ کر کے نہ بتایا جائے۔ ان پر کوئی بات ظاہر ہی نہیں ہوتی، مگر رزاقیہ نشے کی حالت میں شعر کہا کرتے تھے اور چونکہ اس حالت میں بہت دیر تک جاگنا مشکل ہوتا ہے، جس نقاد کو شک ہو کہ خود نشہ کو کے اس حقیقت کو اذیت دے، اس لیے مرزا صاحب کی خود میں اکثر تصریح ہوتی ہیں اور ان میں مطلع

دریغ بھی کئی دھڑکناٹا ہوتا ہے۔ کانارہ پڑخواہ کتنا ہی طویل کیوں نہ ہو، اتنا طویل تو نہیں ہو سکتا کہ فراق گورہ کو پوری کی طویل طویل غولیں اس میں باندھ سکیں۔

یہ تو ہماری خارجی شہادت کی بات۔ اب ہمارے حقیقی جس چیز کو داخلی شہادت کہتے ہیں۔ وہ بھی غالب کے کلام میں جا بجا نظر آتی ہے۔ ان کے یہاں بہت بگڑناخن کا صاف ذکر ملتا ہے۔ ملائکہ دوسرے شاعروں کے یہاں اس کا تذکرہ، اس قدر غافلِ غافل ہے کہ معلوم ہوتا ہے وہ ناخن ہی نہیں رکھتے بلکہ بعض بگڑ تو یہ تذکرہ اس قدر شدت کے ساتھ آیا ہے کہ ہم انہیں نصیات کے ایک جدید دریافت شدہ مرض "ناخن بے گلی" کا شکار بھی کہہ سکتے ہیں۔ پھر غالب اپنے ناخنوں سے مرث غریب کھیلنے کا کام ہی نہیں لیتے۔ اب بیکہ انہیں ناخن برتنے کی عادت ہو گئی ہے اس لیے جب شعور کے جاتے ہیں تو ان کے ناخن مصروف میں آنے کے لیے تڑپتے رہتے ہیں۔ اس لیے ذہنوں کے انگلی کھڑچے جاتے ہیں اور خون کی مزاحمتی شعلہ برہا جاتی ہے جو اس ملک نصیاتی مریض کی ارتقائی علامتوں میں سے ہے۔

پھر کچھ اک دل کی بے قراری ہے  
 سینہ جو بے رحم کاری ہے  
 پھر جگر کھودنے لگا ناخن  
 اس قدر فصلی لالہ کاری ہے

ہانگن اس رنگ سے خون ناپ پکانے لگا  
 دل کہ فتنہ کا دوش ناخن سے لذت یاب ستا

پہلے شعر سے تو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ناخن کے ساتھ کاشمیری طوطی پرہی اور  
 پھاڑنے کی طرح "ختم ریزی" کا قصہ بھی پیدا ہو گیا تھا اور مگر اس طرح ادھیڑ

جاتا ہے گریا دہاں پوست کا پودا بریا جا رہا ہے اور ذوق کاوش ناخن سے لذت پائی ۔  
کارخانہ ظاہر کرتا ہے کہ ناخن بستگی کا مرغن کتنی شدید حالت پر پہنچ چکا ہے ۔

اس مرحلے پر معلوم ہوتا ہے کہ غائب کے احباب نے ان کی ناخن بستگی ،  
کا علاج سوچنے کی کوشش بھی کی ہوگی اور کس طرح دوسرے لوگوں کے ناخن تراش  
بھی دیے ہوں گے کیونکہ ان کے بعض شعروں میں ناخنوں سے وابستہ ایک ایسا  
گہرا احساس محرومی پایا جاتا ہے جو صرف ایک ناخن تراشیدہ شخصیت کا ہی حصہ  
ہو سکتا ہے ۔ اس قدر میں ایسے شعر کہے گئے ہیں جن میں عقدہ ، اگرہ ، کشائش  
کش کش ، زخم وغیرہ قسم کے الفاظ پائے جاتے ہیں مگر ناخن کا کہیں تذکرہ نہیں  
ہوتا ۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ مریض نفسیاتی طور پر اپنی کمزوری کو چھپانا چاہتا ہے ۔  
خود انہیں کے الفاظ میں کہا جائے تو ناخن ایسے شعروں میں "مقدور سے" تذکرہ نہیں

سرکھاتا ہے جہاں زخم سراپا ہو جائے  
لڑتے سنگ بہ اندازہ گفتار نہیں

بل ہوا کلکش پارہ وشت میں تمام  
مٹ گیا گھسنے میں اس عقدے کا ماہر پلا

بے فیض بیوی فریدی حامیدہ آساں ہے  
کشائش کو ہمارا عقدہ مشکل پسند آیا

پہلے شعر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ناخن بستہ ، مریض کو زخم بھرنے پر غار کش  
نے تیار رکھا ہے ۔ دوسرے شعر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ناخن تو کھو چکے ہیں مگر عقدہ  
کو داکر نے کی کش کش جاری ہے اور اس کیفیت پر اتنی ہیس بہتر ناخنوں کے گرو تو کب



کھلتی رہ اور بھی ایک ہو گئی ہے اور اب اس گنہگار کو توڑنے کے سوا چارہ نہیں  
 سدا بقیہ ناخنوں کی انگلیوں سے بھی کہیں گانٹہ کھلتی ہے یا تیسرے شعر سے پھر لڑکی  
 کا عالم بویا ہے۔ اگرچہ یہ شعر غالب کے انداز مشکل پسندی کا آئینہ دار ہے مگر اس میں  
 راز کی یہی بات مخفی ہے کہ ناخنوں سے عروسی نے ایسی کا عالم پیدا کر دیا ہے۔

اور تو اور غالب نے خط ایک ایسا شعر کہہ رکھا ہے جس میں ناخنوں کا تذکرہ بھی  
 ہے اور دوستوں کے کرم کا ذکر بھی ملتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب اپنی  
 داستان المیہ ہم تک پہنچانے کی پوری طرح کوشش کی ہے مگر اب تک کسی  
 نے اس کی طرف اشارہ تک نہیں کیا۔ وہ شعر یہ ہے جسے آپ نے بیسیوں مرتبہ  
 پڑھا ہو گا مگر اب اس نئی روشنی میں پڑھیے تو کیا لطف آئے گا۔

دوست غم خوار ی میں میری سہی فرمائیں گے کیا؟

زخم کے بھرنے تک ناخن نہ بڑھ جائیں گے کیا؟

اس شعر میں دوستوں کا تذکرہ کرنے کے علاوہ ایک بار پھر ناخن ترشوانے کی  
 لاشعوری خواہش پائی جاتی ہے۔ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ناخن بستگی کا رمن کس  
 حد تک جا پہنچا ہے۔

”ناخن“ کے فراق میں غالب نے جو شاعری کی ہے اس میں اتنا کرب پایا جاتا  
 ہے کہ وہ ایک طرح سے کیفیت شاعری کے بالکل برعکس جا پڑا ہے چونکہ ناخنوں کے  
 فراق میں ناخنوں کا مصروف بھی ختم ہو گیا ہے اس لیے اب حالت نشہ میں شعر کہنے  
 کی ضرورت بھی نہیں رہی۔ جب ہم اس طرح کے دردناک شعر پڑھتے ہیں۔  
 کاوش کا دل کرے ہے کتنا شک ہے ہنوز۔

ناخن پر ہستہ من اس گمراہ نسیم باز کا

دور ماندگی میں غالب کچھ بن پڑے تر جازوں

جب رشتہ ہے۔ مگر تھا ناخن گروہ کٹ تھا

تو ہمیں اس سس ہوتا ہے کہ اتنے بڑے شاعر کے ساتھ کتنی بڑی ٹریبیڈی ہو گئی ہے۔ پہلے شعر میں اس شاعری کے ناممکن رہ جانے کا افسوس ہے جو صرف ناخون کے بل پر چل رہی تھی اور اب جس کی انگلیں کا کرنی راستہ نہیں دوسرے شعر میں دور ماندگی کا مفہوم ہے ناخن کا نہ ہونا۔ پہلے ناخن تھے تو گروہ کٹ ناخن کا وقت کبھی کبھی ملتا تھا۔ اس لیے کر لٹے کی حالت کبھی کبھی میسر ہوتی تھی اور اب ناخن نہیں ہیں تو فضا ئے لبیدار گریں ہی گریں نظر آتی ہیں جن کو کھولنے کے مسعد کی ہے۔

مگر غالب کے ساتھ اس سے بھی بڑی ٹریبیڈی ہوتی ابھی باقی تھی۔ میں تو جسے ایسے گرم دھما دست میسر جس سے آسمان کی دشمن کی کیا ضرورت ہے شکر میں لگتا ہے کہ دوتوں کی کامیابی کو دیکھ کر آسمان کو بھی رشک ہوا۔ اور اس نے غالب کے ناخن بڑھنے کا راستہ ہمیشہ کے لیے مسعد کر دیا۔

بخشنا سارے چاکر زوے لہو کو اماں

پر ز کچ باز خے تاکا کر کرے لہو کو ذیل

وہیچے ڈالی ہے پر رشتہ اوقت میں گاندر

پہلے شونگی ہے بن ناخن تدبیر میں کیل

یہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غالب کے ناخن ہر شے اور تدبیر کے ناخن تھے جن میں مینیں گاڑ دی گئی ہیں اور اس طرح انہیں از کارہ فضا کر دیا گیا ہے۔ پہلے زبان میں بال فرچنے اور کھال کھینچنے سے بھی اپنی قسم کی ایک اذیت دی جاتی تھی جن کی تفصیل جرم و سزا کی تاریخوں میں ملتی ہے اور کوئی باشعور اور صاحب ہوش و حواس

علامت کو سرکشی پر مائل نظر آتا تھا اس کے ناخن اکڑوا دیئے جاتے تھے۔ اس بھلا پھول  
 اذیت کا اندازہ صرف اس شخص کو ہو سکتا ہے جو جسم انسانی میں ناخنوں کی اہمیت کو  
 جانتا ہے۔ یہ بھی جانتا ہے کہ ناخنوں سے کیا کیا نادرہ کار جو بے سرو ہوتے ہیں۔  
 ناخنوں سے عورت کے حسن اور اس کے دفاعی اختلالات میں کتنا بڑا اضافہ ہوتا ہے  
 اور یہ کہ ناخنوں کے بغیر انسان کی زندگی میں کیا باقی رہ جاتا ہے۔ غائب کی اس ناخن  
 والی شاعری میں چھپا ہوا ہمارے لیے ایک پیغام بھی ہے۔ وہ یہ کہ ناخن ہوش اور تجربہ  
 کی علامت ہیں اور جب تک یہ قائم ہیں ہمارا جنوں بھی قائم ہے اور ہماری رُخسہ بھی  
 زندہ ہے۔

”کارواں گوبر افروز“



منظر علی ستیہ



مجھ کو کتے کو کیوں رقیبوں کو اک تماشہ ہوا گل نہ ہوا (غائب)

## مرزا غالب پر قاتلانہ حملہ

مرزا غالب کی شاعری کے بارے میں تردیدیں ہو سکتی ہیں کہ ایک طرف یگانہ جیسے "غالب شکن" ہیں اور دوسری طرف مولانا عبدالرحمان بجنوری جیسے "مخلوب"۔ لیکن غالب کی وفات کے بارے میں ایک ہی رائے ہے یعنی ان کا انتقال ۱۸۹۵ء میں ہوا تھا مگر اب جدید تحقیق کی روشنی میں یہ مسئلہ اتنا ناگزیر ہے کہ مشہور محقق قاضی عبدالودود صاحب کی فوری توجہ کا مستحق ہے کیونکہ موصوف دنیا نے ادب میں سال وفات کا پتہ چلانے کے اکلوتے ماہر ہیں۔ ان کی تحقیق کا اعجاز اس امر سے ہو سکتا ہے کہ انہوں نے اس گھوٹے کے سال وفات کا تصدیق بھی کر دیا ہے کہ جس کی وجہ سے وہ نے لکھی تھی۔ یہی قاضی موصوف کو ایک عدد دراصلہ بسلسلہ سال وفات مرزا غالب کہنے کے غم میں ابھی ڈبلا ہی ہوا تھا کہ میرے ایک دوست نے یہ بتایا مرزا غالب کا سال وفات معلوم کرنے کے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں آسان نسخہ یہ ہے کہ فلم "غالب" دیکھ لو تم پرانہ خود صرف یہ واضح ہو جائے گا کہ مرزا غالب کا انتقال اسی سال ہوا ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ کراچی جیسے شہر میں ان کو روزانہ بلاناغہ دن میں تین تین بار قتل کیا جاتا ہے۔ لوگ اس قاتلہ کو دیکھ کر غالب کی اس حرکت پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں کہ اس نے یہ شعر

حق بزرگرم کو غالب کے اڑائیں گے پرنزے

دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ قماش سنہ ہوا

دراصل یہ غم "غالب" بنانے والی پرچھٹا الزام لگانے کی کوشش ہے۔

حالہ جو یہ فلم بنا کر عطاء اللہ ہاشمی اینڈ لکچر نے غالب کے پرنزے اڑانے کی ہر کوشش کی ہے اس کی داوڑ دینا ظلم کے مترادف ہے۔

انہ روئے ملاوڑہ صحافت میرے دوست کے اس سنسنی خیز بیان نے میرے

سمند شوق کے لیے آزاریا نے کلام کیا اور میں غالب کے سال وفات کا تصنیف کرنے

کے لیے کسی قاضی القضاۃ کی طرف جانے کی بجائے سید عطاء اللہ شاہ ہاشمی کی جدید

تصنیف لطیف پڑھنے کے لیے روانہ ہوا۔

غم "غالب" میں نے بچشم خود ہی نہیں بچشم فم بھی دیکھی۔ میری کہہ میں یہ بات

نہیں کہی مگر غالب کی وفات کے تقریباً سو سال بعد اس پر قاتلانہ حملہ کرنا کیا معنی رکھتا

ہے اگر یاسس دیکھنا مرحوم زندہ ہوتے تو اس فلم کو دیکھ کر نہایت خوش ہوتے اور

اب بھی یقیناً عالم باہ میں ان کی روح وہ سرور حاصل کر رہی ہوگی جو انہیں "غالب" کی

نامی مجرور رہا حیات کھو کر بھی حاصل نہ ہوا ہوگا۔

۱۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت غالب کی روح قفسِ عنصری سے پیدا ہو کر گئی اور وہ بارگاہِ

ایزدی میں پہنچے تو ان کے اندیشے کے مطابق فرشتوں کے کلمے پر ان کی جڑ بونی اور یہ

سزا تجزیہ ہوئی مگر اس سزا سے ڈرتے سنل میدان کے باسے میں ایک غم بجائی جائے

جس میں جدتِ مہوشی بہرہ کا رول ادا کرے، غالب نے جب یہ سزا سنائی تو ان کے

ہاؤں کے نیچے سے کھان نکل گیا اور انہوں نے احمہ باہمد کو نہایت عاجز اور مددگار

کی یہ سزا بہت بڑی ہے میرے گناہ اس سزا کے مقابلے میں بہت کم ہیں۔ یہ

گناہ مذکرات اہل عرب کے نزدیک ایسے تھے جن کی تلافی غالب کو کاش ممکن نہ تھی

ڈالنے سے بھی نہ ہو سکتی تھی۔ اس لیے غالب کے لیے مرزا سزا بہ تجویز کی گئی کہ جب تک عیادت  
 صبر و تحمل کی فلم بن جائے تو اس کے بعد غالب کی زندگی کو دوبارہ نکھایا جائے اور اس میں  
 ہیر و کاروں کا سیر اور سروے یہ سنگر غالب کی آنکھوں میں آسوا گئے۔ وہ مرزا کا ہاتھ کھینچنے  
 ہی والے تھے کہ ایک دم اس خیال سے غاسٹ ہو گئے کہ کہیں مرزا میں اور اضافہ نہ  
 ہو جائے اور سدھیر والی فلم کے بعد کوئی ایسی فلم نہ بن جائے جس میں ہیر و سدھیر یا عریقت پر  
 اس واقعے کے راوی مولانا ابراہیم جلیس ہیں جو بھول عریز کار ٹرنسٹ، موقع دارات  
 پر مہرہ نہ تھے۔ قطع نظر اس کے کہ یہ واقعہ جھوٹ ہے یا سچ یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ غالب  
 ان کے گن جوں کی سزا اس صورت میں مل رہی ہے کہ ان کی زندگی فلم سازوں کی قریب کا  
 مرکز بنی ہوئی ہے۔

ہاں قربات ہو رہی تھیں مولانا غلام احمد ہاشمی کی فلم غالب کی۔ اس میں  
 بظاہر تو سدھیر نامی ایک لڑکھو مرزا غالب کے روپ میں پیش کیا ہے لیکن دراصل اس فلم  
 میں غالب نامی ایک شاعر کو مشہور فنکار سدھیر کے روپ میں پیش کرنے کی کامیاب  
 کوشش کی گئی ہے۔ مرزا غالب نے ایک شاعر ہو کر جس طرح ایک عظیم ایگزیکٹو کا بدل  
 اوا کیا ہے۔ اس کی عادتیں وہی جاسکتی۔ مرزا صاحب پنجاب کا اندوختنی روانے سے  
 بولتے ہیں جیسے ان کی زندگی شاہجہاں آباد میں نہیں ہو آج پنجاب میں گزری ہو۔ وہ  
 بادشاہ وقت کے دربار سے غصے میں بھرے ہوئے اس طرح اُٹھتے ہیں جیسے کوئی پہلا  
 ٹھکرت کھا کر اکھاٹے سے ٹھکتا ہے، مرزا صاحب کافن اس وقت کمال کی بلند ہیں  
 کہ چھوڑتا ہے جب وہ اپنے شہر آپ ہی غلط پڑھتے ہیں۔

نورجہاں اس فلم کی ہیروئن ہے، غالب کو وہ اندرون سے ملادہ ہیرا منڈی، مرزا جی  
 کہہ کر مخاطب کرتی ہے، نور گلواڑ کی تمام شکوک و شبہوں کے باوجود وہ غالب کی حقیقتی  
 محبوبہ نظر آتی ہے۔ یعنی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے اپنے غلطوں میں جس ڈومنی

کا ذکر کیا ہے وہ اسی حکم زندہ ہے اور اس کے بڑے حلقے کا خیال نہ کرتے ہوئے اسے  
فلم کی سیرین بنکر حقیقت کی عکاسی کا حق ادا کیا گیا ہے۔

اس فلم کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ اگرچہ اس میں ایک صدی قبل کی معاشرت  
کا فرض پیش کرنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ غائب کی شاعری کی طرح فلم بھی زمان و مکان کی  
قید سے آزاد و مسلم ہوتی ہے۔ اس اجمال کی تفصیل، اس اسباق کی توضیح، اور اس  
اشکال کی تحلیل یہ ہے کہ غائب کے زمانے میں نائیلون کے دوپٹے کا عام مدعا تھا۔  
چائنا مارٹ امار کی دہر کے برتن استعمال کیے جاتے تھے۔ لہجے کی جدید طرز کی  
اماریاں (۱۹۴۵ء) گھروں میں عام ہوتی تھیں۔ دارود شہر ۱۹۱۵ء کی ہندوستانی پولیس  
کی مددی پہنا کرتا تھا۔ پائٹھو کہیں کے ہوتے بھی عام طور پر چلتے تھے۔ مشرق کی بریاں  
شہروں کے دوستوں سے پردہ نہیں کرتی تھیں، عمارتوں پر ناموں کے بورڈ لگائے  
جاتے تھے ہر گھر میں جدید طرز کی سنگسار میز ہوتی تھی وغیرہ وغیرہ۔

بہادر شاہ ظفر کے دربار میں جو شاعر ہوتا تھا وہ بھی ایک دلچسپ چیز ہے۔  
سامعین شہزاد کو دادا کس طرح دیتے ہیں جیسے کوئی درد قریب سے چنچلاتا ہے، بہادر  
شاہ ظفر کے بہادر اور بیٹو پاکستان کا چچا کے اسٹوڈیو میں کچھ تو فرق بننا چاہیے۔ اس  
مشاعرے میں شہزاد قریب سے اپنا کلام پڑھتے ہیں۔ مومن خاں مومن کا ردل حبیب جالب  
نامی شاعر نے ادا کیا ہے اور مومن کی غزل اپنے مخصوص ترنم میں پڑھی ہے۔ جہاں اس  
پر کوئی اعتراض نہیں کہ حبیب جالب کو مومن کے درجے تک پہنچا دیا جائے لیکن یہ گلو  
نہیں کہ مومن کو جالب کی سطح پر لگایا جائے۔

فلم کے مکالمے سننے سے زیادہ دیکھنے سے تسلی رکھتے ہیں کیونکہ جب اداکار برائے  
موتے الفاظ ادا کرتے ہیں تو ایسا مسلم ہوتا ہے جیسے درد و زہ میں مبتلا ہوں۔ مکالمہ  
نگار نے نوٹس نہ لیا کہ جہاں مکالموں میں غائب کے اشارہ زیادہ سے زیادہ کھپا جاتے

اس ”کہت“ کی وجہ سے بعض مکالمے خاتیت دلپسپ ہو گئے ہیں۔ مثلاً ایک موقع پر غائب کے کچھ دوست ان کو اپنے ساتھ بحرے میں لے چلنے پر اصرار کر رہے تھے ہیں۔ ایک صاحب کہتے ہیں ”مرزا صاحب آپ کو ضرور ہمارے ساتھ چلنا ہوگا، آپ کے بغیر بحرے کا مزا نہیں آئے گا۔ غائب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں۔“ اس مکالمے میں یہ مصرع جس غزل سے استعمال کیا گیا ہے کہ وہ اپنی مثال آپ ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ غلام سادوں نے غائب کی بیوی کی زبان سے یہ مصرع نہیں کہلایا۔

مفتی صدر الدین آندہ بھی اس غلم میں نظر آئے ہیں جو شکل و صورت سے مفتی انتظام اللہ شہابی اور حرکات و سکنات سے ممتاز مفتی مسلم ہوتے ہیں ان کی عدالت کرسی میرزا اور ایک عدد مجرموں کے کھڑے پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس کی عدالت کی ”جی“ سے ریٹائر ہونے کے بعد وہ وکیل کے روپ میں بھی نظر آتے ہیں غائب پر غلم میں دو مقدمے چلتے ہیں اور دونوں بار مفتی صاحب ہی غائب کے آٹھے آتے ہیں۔ پہل بار غائب پر جب مقدمہ قائم ہوا تو مفتی صاحب ”جج“ تھے۔ دوسری بار مقدمہ برہاتو وکیل تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ غائب پر کوئی تیسرا مقدمہ نہیں چلا ورنہ مفتی صاحب ”جج“ کے کھڑے میں کھڑے ان کے خلاف گواہی دے رہے ہوتے! ادب کے وہ طالب علم جو غائب کے نظریہ عشق کو کڑا کڑا تنقید جیسے حکمائے ادب کی تحریروں میں دیکھتے ہیں انہیں یہ غلم ضرور دیکھنی چاہیے کیونکہ غلم میدان عشق میں غائب جہانی طور پر ہی نہیں محفل طور پر خاصا نما نظر آتا ہے اس کی تمام حرکات عام غلم عاشقوں کی سی ہیں اور وہ کہیں بھی مرزا اسد اللہ خاں نہیں ہوتا۔ وہ عاتب جہا نے دیر ان میں نظر آتا ہے، وہ غائب جہا نے غلام میں نظر آتا ہے اور وہ غائب جو ”یادگار غائب“ کے صفحات میں نظر آتا ہے۔ العزمن عطا اللہ لاشی نے یہ غلم بنا کر غلمی دنیا میں وہی مقام حاصل کر لیا ہے، جو انسانی دنیا میں عام بصل کو حاصل ہے۔



## ہونی مدت کہ غالب مر گیا

غالب کا چند روز کا دوران ہمیشہ سے ہماری محبوب کتاب رہی ہے۔ اس کا انتخاب  
 خوب صورت جرمن ایڈیشن تو تعویذ کی طرح سسزا اور سسفر میں ساستی بنا رہتا ہے۔ دل  
 خوش، مرڈ ٹھیک اور طبیعت موندوں ہو تو غالب کے دل کش، پر جوش اور طرب افزا  
 اشعار اور سچ کھتی ہوئی غزلیں دماغ میں اور زبان پر رہتی ہیں۔ پریشانی ہو تو پڑ سوز و پراثر  
 شعر دل بہلاتے ہیں رنج و غم ہو تو دلی سی و ناکامی سے سہرہ پر شعرا سے ہلکا کرتے ہیں۔  
 کہیں کہیں ہیں بھی ہوتا ہے کہ بیماری کی شدت میں ہمارا ذہن غالب کے حسین و پراثر  
 اشعار کی ناصقل پر چڑھ کر رہنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ جی اں یہ گستاخی عام طور پر بیماری  
 کی شدید تکلیف میں ہوتی ہے۔ مثلاً ہمارے گڑے کا آپریشن سہا تو یہ شعر الہام ہمارے

شق ہو گیا ہے گردہ خوشالذت فراغ

تکلیف پردہ داری درد و گھر گئی

اور ذہن کے شدید دردوں میں تو غالب کے اشعار نہ اس قدر دل سے ہمارے۔

بڑے آسانی سے بن جاتے ہیں

دور کا مرنے بھی کہ جانے کیا قیامت ہے

کہ بے اثر و کیسی نالہ نارس بابا !

یا

کافس ہے صبرِ طلب سانس ہمارا بے تاب  
دل کا کیا رنگ کریں خون جگر جھٹنے تک  
اور

نارے دم میں چند جھانے سپردِ سنے  
جرواں نہ سر جھٹنے وہ یہاں آگے دم جھٹنے

اس ذکر سے مطلب نصیب دشمنانِ یہ غلط فہمی نہیں کہ خدا خواستہ ہم میں شعرِ گزل  
کے جراثیم موجود ہیں بلکہ اس محبت اور شغف کا احترام ہے جو ہم کو غائب کے اشعار  
سے ہے کہ درد کی تکلیف میں کمی بھی اسی بہانے ہوتی ہے۔

ایک رات کچھ ایسی ہی حالت تھی۔ دوسری تکلیف سے کمی راتیں آنکھوں میں  
کٹ چکی تھیں۔ تیار دار تھک کر سو گئے تھے۔ مگر ہماری آنکھوں سے نیند کو سوں دور  
تھی اور دماغ شکارِ غائب کے اس شعر کا درد کیے جا رہا تھا خدا سے تصرف کے بعد

کاوے کاوے سنت جانی لڑتے بیماری نہ پلچ  
صبح کو ناشام کا لانا ہے جوئے شیر کا

ایک شعر کی تحمارے جنگ اگر ہم نے سرانے کی اناری سے لہو بڑھا کر  
دیرانِ غائب اٹھایا۔ یسپ کا بڈسوچ دیا اور دوسری رات اور چہر کی شب کا سواڑ  
مشرع کر دیا کہ نفسی زیادہ سنت زیادہ ناقابلِ برداشت ہوتی ہے!

کیوں اندھیری ہے شبِ موسم۔ "جے جاؤں کا جو دم  
آج اور جی کو رہے گا دیدہ اختر کھلا؟

پڑھتے پڑھتے جب اس شعر پر پہنچی

برقی دھت کو غائب مرگیا پیدا آتا ہے وہ ہر اک بات پر کنکریں پاتا کرنا ہوتا

قوم ملک گئے کیا یہ شعر غائب کا ہے یا ان کی بیوی کا اصلاً مرنے کے وقت بعد غائب یہ شعر کہ کر کیسے بھیج سکتے تھے، ابھی تک تو ان ٹریس کا ادھر ادھر سے براہ راست تعلق قائم نہیں ہو سکا ہے اور ہجرت بعد اس ملک سے غائب کو اندرون یا دکن یا سوا ان کی بیوی کے۔

میں یہ سوچ رہی تھی کہ مجھے اپنے سر پڑنے سے کسی کی ہلکی سی ہنسی کی آواز آئی، یہ کرن ہنسا! میں نے تخیلوں پر ٹپکے سر کو مشکل اشیا یا ترکیا دیکھتی ہوں کہ سر سے پٹن تک سفید پاکیزہ لباس میں عبوس ایک نرانی صورت لی لی ہاتھ میں قسیج لیے بیٹھی ایک خاص انداز میں ہنس رہی ہیں۔ جیسے ماں بچے کی، اماں پر پیار بھری طنزیہ ہنسی ہنستی ہے۔ میں نے ہجرت سے ان کی طرف دیکھا، وہ دلی کی پاکیزہ اور پوجدار اور شیریں زبان میں خاص حرکتوں کے لمحے میں ہولیں بچتی ترغاب کی بڑی دلدادہ ہے، دلدادہ غیر سے اٹھ رکھے اپنے نزدیک شعر و سخن کا ذوق بھی رکھتی ہے۔ کیوں جھوٹ کہتی ہوں ہجر بھی تجھے اس میں شبہ ہے کہ یہ شعر غائب کا "اللہ انہیں کرٹ کرٹ بہشت نصیب کرے" ہے یا "ان کی بیوی کا؟"

مجھے حیرت تھی کہ یہ کرن لی لی ہیں جو ایسی پیاری زبان بول رہی ہیں اور بغیر کچھ میرے خیالات جان گئیں۔

"اے اداں! تیرا خیال درست ہے۔ یہ شعر غائب کی بیوی ہی کا ہے اور ایک اسی شعر پر کیا سوچا ہے۔ غور سے ان کا دیوان پڑھو بیوی بھر دیکھو گی کہ اس میں کتنے شعراں کی بیوی کے سر جو ہیں۔"

اب تو میں سنہیل کر بیٹھ گئی۔ واہ یہ بزرگ خاتون بھی خوب ہیں کس آسانی اور یقین سے وہ اتنا بڑا دعوے کر رہی ہیں آغراں کے پاس اس کا ثبوت کیا ہے؟ میں نے فدا جرات کر کے پہلی بار زبان کھولی مگر "مثلاً" سے زیادہ کچھ نہ کر سکی۔

سوائے باستانیوں کہاں تک دوں گی، وہ چاروں جس شعر میں تو کوئی مشابہت سے  
سمجھائے۔ وہاں تو کتنی غزلوں میں اس کے شعر موجود ہیں کتنے قلموں میں وہ نظر آتی ہے  
فساد کیلئے والی آنکھ، سوچنے والا دماغ اور عقل سلیم ہر تب ہی اس کی پرکھ ہو سکتی ہے  
بہن۔ تو نے اس شعر کے بارے میں سوچا اور یہ شعر بتاؤں گا ہے۔

گھر میں کیا تھا کہ تراغم اسے غارت کرنا  
وہ جو رکھتی تھی میں ابک حسرتِ تعمیر کو ہے

اب تو میں اور جو کتنی بولی ابیسی ان کی بہ حضرت نے غائب کا اتنا اچھا شعر بھی  
ان کی بیوی کو بخش دیا۔ اس طرح تو یہ سارا دلیہ ان کا دیوان ان کے نام منسوب کر دے  
گی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے احتجاج کیا۔ ”مگر دیکھیے تو مصرعہ ہے نہ۔“  
”وہ جو کہتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر کو ہے“

وہ چہرہ نہیں، وہی بزرگانہ ہنسی۔ ”اے ہے محبت کہ آج کل کی لڑکیوں کو ذوق  
آتا ہے۔ اول تو مصرعوں ہر تب بھی غائب کی بیوی کا ہو سکتا ہے۔ مگر وہ یوں  
ہے جیسے میں نے تجھے سنایا۔ تو تو ہانتی ہو گی کہ پہلے زمانے میں یا نے معروف اور طے  
جھول ایک ہی طرح چھوٹی سی کے انداز میں لکھی جاتی تھی، غائب کی بیوی بے چاری  
کے کئے شعر تو کتابت کے اسی ایک غلط اصول کے سرمدے ہو گئے۔“

سہل نہیں کیسے مان بیٹھ کر میرے محبوب ترین شاعر غائب کے اشعار کسی اور کی  
ملکیت ہیں۔ ڈر تو لگتا تھا کہ ڈانٹ نہ پڑ جائے۔ مگر میں ایسی آسانی سے ہتھیار ڈالنے  
والی نہ تھی۔ یہ سہل آپ کیا فرما رہی ہیں۔ غائب کی دقیدوسی، ”اُن پڑھ بیوی سہل  
شعر اور ایسے شعر کتیں جن پر آج تک اہل ذوق غائب کے اشعار کا دھکا ہوتا ہے یہ  
میں نہیں مان سکتی۔“

ایک لمحے کے لیے بڑی بی کا چہرہ قہقہہ اٹھا مگر پھر شفقت بھری مسکراہٹ ہمیں

پر کہنے لگی: "احتمیٰ تیرا نسب تیرے زمانے کا قصور ہے۔ آج کل کی لڑکیاں اسکولوں میں چار عرٹ گٹ پٹ کے پڑھ کر اپنے کو عالم فاضل سمجھتی ہیں اور پڑانے زمانے کی عورتوں کو جاہلی محض۔ تو نے کیسے یہ سمجھا کر غائب کی بیوی جاہل بے وقوف اور وقفا قرسی صحتی۔ وہ ایک عالم فاضل خاندان کی بیٹی تھی جو ذوق شعر و سخن میں سارے ہندوستان میں مشہور تھا، پھر اس کا غائب جیسے جیسے بے مثال شاعر کا پچاس سال سے زیادہ ساتھ رہنا پڑا نہیں؟ تو بوا ایسے گھرانے کی لڑکی، ایسے خاندان کی بیوی!! اور اگر اللہ میاں نے بھی اسے شعر کہنے کا ذوق دیا ہر تو پھر! پھر بھی تو کیسے لگی کہ اس کا شعر کہنا اور اچھا شعر کہنا کیسے ممکن ہے؟"

میری دلپس اب محبت کی مدد تک پہنچ گئی تھی اور زبان کھولنے کی یوں بھی ہرأت مشکل تھی۔

"غائب کے دیوان میں تجھے کتنے ہی شعر ملیں گے جو ان کے نہیں ان کی بیوی کے ہیں۔ جانتی براہمہا کہ ان دونوں کا بیابہ بہت زعمری میں ہو گیا تھا، کچھ شعر زعمانی کے اسی رنگین زمانے کی یادگار ہیں۔ جب غائب کا بالکا اور مردانہ حسن اس کے دل میں کھب کر رہ گیا تھا۔ مشرقی حیا دار بیوی ہوتے ہوئے بھی آخر دل تو وہ بھی رکھتی تھی، تاہم وہ! اسی زمانے کا ایک شعر ہے۔

سبزہ خط سے تہا کا کل سرکش نہ دبا

یہ زمرہ بھی حرلیت دم افنی نہ ہوا

ایک بار سچ بن کر کہیں! ہر ہانے گئے بیوی کو دھج دکھانے آئے ہو کیسا لگ

ملا ہوں فی البدیہہ کہا ہے

توے جاہر طرٹ کڑا کو کب دیکھیں

ہم امیج طاب سل و گھر کو دیکھتے ہیں

یہ تو بری تم جانتی ہو کہ شاعر عاشق منور رہتا ہے چاہے سچا عاشق ہو یا جھوٹا موٹ  
ہن ہاتا ہو۔ اب ہوا جانے میری بلکہ وہ جو عشق پر شرکتے تھے تو سچ چاہے کسی پر عاشق تھے یا  
بیوی کو جلاسنے کے لیے بن گئے تھے۔

بیوی نے کسی دوسری دوسری کو آشکر سے کبھی نہیں دیکھا، مگر ان کے شعروں میں  
ان کے عشق کی داستان پڑھا اور سن منور کرتی تھی۔ اور تم بھی ہوا محبت ہو۔ محبت  
کے دل کا مال ہو سکتی ہو۔ شریف زادیاں منور سے نہ کہیں۔ چاہتی تو یہی ہیں کہ ان کامیاب  
ان کی محبت کی داستان کے سوا کسی اور کا ذکر ہی نہ کرے۔ مگر غالب ظہرے شاعر وہ بھی  
غزل گو، رند مشرب۔ اب تم ہی کہو ان کی باتیں سن ہی کر بیوی کا دل جلتا یا نہ جلتا؟ ان  
کی بیوی کے اس زمانے کے شعروں میں شکوہ و شکایت بھی ہے اور اپنی چٹکی چٹکی شریف  
زادیوں والی محبت کا اظہار بھی ملنے لگتا ہے بھی ہیں اور نصیحت و نصیحت بھی۔ مگر ہوا  
غور کرو گی تو ہر جگہ ایسی اپنیت پاؤ گی جو صرف بیوی کا ہی حصہ ہو سکتی ہے۔ تم ہی کہو یہ  
شعر کس کا ہو سکتا ہے۔

ہو گئی ہے غیر کی شیریں زبانی کا رگر

عشق کا اسی کو گمان ہم ہے زبانوں پر نہیں

یہ بے زبان محبت مرد و عورت اس کی بازاری حشر تو نگوڑی کیا کہا کے کرے  
گی! بیوی جب میاں سے شکایت کرتی تو وہ یا تو کوئی بہانہ بنا دیتے یا کہتے ہم تو یہ باتیں  
محض تمنا سے کہنا کرتے ہیں تو اس کے سوا اور کیا کہتی ہے  
یہی ہے آؤنا تو سنا کس کو کہتے ہیں!  
عدو کے ہو لیے جب تم تو میرا امتحان کیوں ہو!

لیکن یہ سب منور سے کہنے کی باتیں تھیں، بیوی کے دل کی کسپی آواز نہ ہو

حق ہے

ہم کرنی ترک دین کرتے ہیں

نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی

لیکن رشک و رقابت تو پہچانیں چھوڑتے۔ جب کہیں مجھ سے بسرے  
غائب اس کی طرف متوجہ ہوتے تو وہ شعروں ہی میں دل کی گئی کا انداز کیا کرتی، جانتی  
تھی تاکہ حساس شاعر کے دل پر کیا چیز زیادہ اثر کرتی ہے۔ اس قسم کے مدح پار  
شعر بھی سن لے۔ ایک دن آب دیدہ ہمیشہ تھی۔ غائب نے پوچھا کیا بات ہے؟  
ٹھٹھک کر بولی ہے

دل ہی تو ہے نہ رنگ نہ فشت درد سے جبر نہ کئے کیوں؟

روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہیں ستائے کیوں؟

اس لفظ "کوئی" سے تجھے نشان نہیں ملے کہ یہ شعر کس کا ہے؟ اور اگر وہ کہیں  
دلدار ہی کرتے تو جھٹ دل الجھل جاتا ہے

تم جاؤ تم کو غیر سے گر رسم و راہ ہو

مجھ کو بھی پہچنتے رہو تو کب گناہ ہو

غائب نیک دل با محبت اور شریف آدمی تھے ان باتوں پر خواہ مخواہ شرمندہ  
ہو جاتے تو شوقی سے کہتی ہے

کہیں نیکی بھی اس کے جی میں گرا اہلئے ہے مجھ سے

جہانیں کر کے اپنی یاد، شرمنا جائے ہے مجھ سے

ایک بار کوئی دن غائب کی صورت نظر آئی! "اُجیب آئے اور محفّت کی قربان  
جی ہاں جانتی ہوں ہے

ہوں! تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا!

آپ آئے تھے مگر کوئی حناں گیر بھی تھا

”دیر پہنٹھی سانس جبر کر گیا ہے

تم سے بچا ہے مجھے اپنی تپا ہی کا گواہ

اس میں کچھ شائبہ غلطی تقدیر بھی تھا

ایک بار بہت دن کے بعد غائب نے پاؤں دہرانے کی خواہش ظاہر کی۔ ایسے

موقعے بھی کبھی نصیبوں ہی سے ملتے تھے۔ خوشی کے مارے اس سے دہاتے نہ

بن سکتا۔ انہوں نے پوچھا کیا بات ہے؟ کیسے دہا رہی ہو؟“ مسکرا کر جواب

دیا ہے

اتمد خوشی سے میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے

کہا جو تھنے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

جوں جوں زمانہ گزرتا گیا آپس کی یگانگت اور بے تکلفی بڑھتی گئی یوں سمجھ

کہ اب مشتاق رنگ نے دوسرا رنگ چکھ لیا۔ غائب کے شاعرانہ مزاج کا لا ابال

ہی برہم تھا تو بیوی کی نصیحت فطرت بڑھی مٹھ گئے

دلنے گر میرا ترا انصاف مٹھ رہی نہ ہو

اب تلک تو یہ توقع تھی کہ وہاں جو جائیگا

ڈنڈگی اپنی جو اس رنگ سے گزری غائب

ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

غائب کی باوہ غواہی تو سمجھ سکتی ہے بچی کہ ان کی باخدا بیوی پر کیسی بار گزرتی

ہوگی۔ غائب کی وہ مشہور غزل تو تجھے یاد ہوگی ہے

دستا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا

ایک دن وہ بڑے انہماک سے بیٹھے اسے کھڑے تھے بیوی بھی قبیح

پھیرتی اور ہر سے گزریں اور معرفت جبر سے یہ غمخیزن کر بہت متاثر ہوئیں۔ غائب



نے پوچھا کہ کیسے ہیں! بے اختیار بولیں ہے  
 یہ مسألی قصوت یہ ترا بیان غائب  
 تجھے میں دل سمجھتی جو نہ بادہ خوار رہتا  
 ایک بار غائب نے کہہ جانے کا ارادہ ظاہر کیا صاف صاف تو نہ کہہ سکی کہ یہ  
 حرکتیں اور یہ قن۔ بس آنا کہہ کر رہ گئی ہے  
 کہہ کس منہ سے جاؤ گے غائب  
 مشرم تم کو مگر نہیں آتی !  
 غائب کو گدہ ٹی دانہ سے پریشان اور ابانے دانہ کے روپ سے رنجیدہ دیکھتی  
 تو دلہن ہی اور دلہن ہی بھی کرتی تھی۔ ایک بار سمجھاتے سمجھاتے اکھنوں میں ہنس  
 پھر کر بولے

بے گانگی مطلق سے بیدل نہ ہو غائب  
 کوئی نہیں تیرا تو میری مہمان خدا ہے  
 ایک شعر اس وقت کہ ہے جب غائب نئے نئے جہاں پناہ کے مدار سے  
 وابستہ ہوئے تھے ان کو چھیلنے کے لیے کہہ اٹھیں ہے  
 بنا ہے شہ کا مصائب پھر ہے ہے اتراتا  
 وگرنہ شہر میں غائب کی اکبر وکب ہے  
 یہ ایسی ہی محبت بھری نوک جہونک تھی جیسی غائب اپنے انداز میں  
 اپنے خطوں میں کیا کرتے تھے۔ ایک بار انھوں نے بھی تو جیروی کو  
 چاہے تشبیر دی تھی! مگر تو بھی جانتی ہے اور وہ بھی جانتی تھی کہ یہ شخص  
 ان کی گنجائی بیان اور نظر اعجاز طرز اول ہے۔  
 تجھے بہن شعر غائب کے ہاں زمانہ لب و لہجہ میں کہے ہوئے نظر آئیں گے

اگرچہ جو کچھ ہم میں نے تجھے ان کی بیوی کا اچھی طرح سنایا اس میں زمانہ بولی کہ ہے۔  
غائب کی صحبت کا اثر تھا نا اس پر پھر بھی کبھی کبھی اپنا مخصوص رنگ جھلک  
اُٹتا ہے۔

دلی سادگی سے جان پٹوں کو کہ کن کے پاؤں  
بیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیریزن کے پاؤں  
غائب کی ایک مشہور غزل کا مطلع ہے۔

حیرا ہوں دل کو روڑوں کو پیٹوں جگر کو میں  
مقتدر ہو تو سب تو رکھوں زمرہ گر کو میں

اس کے پہلے مصرعہ میں تجھے کس کی بولی نظر آتی ہے۔ یہ بیوی کا مصرعہ ہی  
تو تھا جس پر گڑھ لگا کر انھوں نے مطلع کہا اور پھر اپنی وہ مشہور غزل مکمل کی۔  
ایک اور شعر خالص زمانہ بولی میں اس وقت کا ہے جب نیا نیا جیاد ہوا تھا۔  
میرے ہونے میں ہے کب رسوائی!  
اے وہ خلوت سہی جلوت نہ سہی

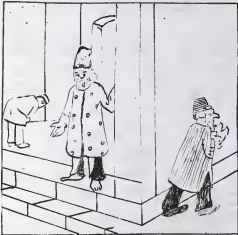
میں سب کچھ بھول کر ان بڑی لی کی مسکوک باتیں سن رہی تھی اول کہ رہا تھا  
کہ ذرا دیر یہ اور بیوی گئیں تو غائب بے چارے کو جہی کے دیوان کا جگمگیں ہی بہت  
کہ ہے بالکل تھی دست نہ کر دیں اور وہ کہے جا رہی تھیں، لیکن جب پہاس برسی  
کا ساتھی بھر گیا تو باغابی بیوی کا دل ٹوٹ گیا۔ شعر سننے سے بھی جی بھر گیا اور سوا۔  
اللہ اند کرنے کے کچھ بھی یاد نہ رہا۔ غائب کے بعد اس نے بہت کم شعر کہے۔  
کبھی کبھی کراہ کے ساتھ کوئی شعر بے ساختہ منہ سے نکل جاتا تھا۔ ان ہی میں سے  
ایک مجھے یاد آیا ہے

غائبِ خستہ کے بے زکون سے کام بند ہیں ا  
 روئے زار وار کیا کیجئے اے اے کیوں  
 بارہ شہر جوئی نے تجھے بنایا تھا اپنا دیران گھر دیکھ کر دل سے نکلا تھا۔  
 گھر میں کیا تھا کہ تراغم اسے غارت کرتا !  
 وہ جو رنگستی سستی میں اک حسرتِ تیسرے سو ہے  
 اور یہ شہر تو اکثر زبان پر رہتا تھا جسے تم ابھی پڑھ رہی تھیں ہے  
 ہوئی مدت کہ غائب مرگب پر یاد آتا ہے  
 وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا — ”اگر“

اب جو غور سے ان کی صورت دیکھتی ہوں تو بے لوث — میں کہتے ہیں رہ گئی  
 یہ خواب ہے یا بیداری — میں سوتی ہوں یا جاگتی — گرا پڑا رنگ میچھے  
 نقش و نگار و ہار و خاندان کا مخصوص انداز اور آپ کرشمی و مصلی ہوں زبان —  
 میرے منہ سے نکلا — آپ — آپ — امراؤ بیگم — امراؤ بیگم —  
 میں نے آنکھیں کھریں۔

کونسی کے ایک جھٹکے نے مجھے کیوں سے کیوں لا پھینکا، کونسی میرا بازو چاکر کہ  
 رلاتا — کیا ہوا — کیا ہوا — کسے پکار رہی ہو۔ کون امراؤ بیگم امیرا  
 سانس شدت سے سچول رلاتا۔ سینے پر دیران غائب کند پڑا تھا۔

صالحہ عابدہ حسین



کیا وہ فرود کی حسدوائی تھی      بنگلہ میں مرا سجدات میرا (غائب)

## غالب اور محشر کے سامنے

صور کی حبیب اور ہیبت تک آواز سے دل بیٹھا ہار رہا تھا۔ مردوں کی دنیا میں ایک ہنگامہ رہا تھا۔ سب کے سب ایک دوسرے کو دھکا دے کر آگے پیچھے بیٹھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ برقیامت آگئی۔۔۔ برقیامت آگئی۔۔۔ کاروبار فرسا شور۔ اس پہلے میں میں بھی آگے بڑھا۔ قبروں سے جلدی جلدی سامنے فردے اس طرح نکل رہے تھے جیسے دلاڑی کے پشیمانی گنئی گنئی کر گاؤں دلاڑی گاؤں چھوڑ رہے ہوں۔

میری حیرت کی آستانہ رہی۔ جب میں ایک قبر کے پاس سے گذرا اور دیکھا کہ قبر کا مردہ سکون اور اطمینان کے ساتھ سو رہا ہے۔

گویا ابھی سُسن نہیں آواز صور کی

دانش کا کفن مٹی کے اثر سے گل چکا تھا۔ میں جبران شاہ خدا یا یہ کیا ہے جسے اس افراتفری کے عالم میں بھی قرار ہے۔ میرے قریب ہی سے دو آدمی گزرتے ایک نے دوسرے سے کہا ہے

یہ دانش بے کفن آسرخۂ ہاں کی ہے

حق مغفرت کرے جب آواز مردِ صفا

ابھی کچھ ہی دیر گذری تھی کہ دانش میں حرکت جذبہ نے لگی اور ہاتھ دیکھتے ہی دیکھتے

اس لاش نے ہر ہر غائب کی شکل اختیار کر لی۔

غائب کی چٹون سے صاف غصہ کا اظہار ہو رہا تھا۔ اور انہوں نے بڑے ہی جلد  
ہوئے انداز میں کہا ہے

دائے واں بھی شور مچانے نہ دم لینے دیا

مے گیا تھا گر میں فراقِ تن آسانی مجھے

جب انہوں نے اپنی قبر کے چاروں طرف نظر اٹھا کر دیکھا اور انہیں پتھر نظر  
آئے جو سینکڑوں برس سے ان کی قبر کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ ذرا مسکراتے ہوئے  
لگنے لگے ہے

پس از مردن بھی دیوانہ زیارت کا مطلقان

شرارِ سنگ لے تربت پہ میری گل نشان کی

اب جو انہوں نے نظر اٹھائی تو نہ صرف انہیں کو جگہ جگہ جیسے اور کئی خاص شکلوں  
کو اپنی طرف گھورتے دیکھا۔ یہ دیکھتے ہی وہ کھڑے ہو گئے اور اوپر نظر اٹھ کر  
کہنے لگے ہے

ہوئے مر کے ہم جو سوا ہوئے کیوں نہ فرق دیا

نہ کہیں جنت نہ آشتا نہ کہیں مزار ہوتا

ابھی ہم یہاں اس نکلا سے میں مشغول تھے کہ ایک ایک آواز آئی۔

”میدانِ حشر میں چلو اور دادِ حشر سے اپنا فیصلہ حاصل کرو۔“

ہم بھی کچک کر پہنچے کیا دیکھتے ہیں کہ سب لوگ مراتب کے لحاظ سے کھڑے تھے۔

ایک طرف صرف عوام کا مجمع تھا۔ گھنٹس گھنٹے جیسی اس مجمع میں آگے جگہ مل گئی کہیں  
پیسندہ لوگ نہ تھے تو کہیں اور یاد اور صوفیاء کا کہیں علماء کا مجمع تھا تو کہیں حناؤ۔ کہیں شراب  
کھڑے تھے تو کہیں مضمون نگار حضرات اور ادیب۔

خدا کے نیک بندے جنت میں جا رہے تھے۔ باری۔ باری اور اللہ شہزاد کی باری  
مستی۔ دو چار ناموں کے بعد آواز آئی۔

”اس رشتہ ناں غالب ولد مرزا عبداللہ بیگ غلام حاضر  
غالب آگے بڑھے اور سجدہ کر کے کھڑے ہو گئے۔ آواز آئی۔

”اس شخص کا نام اعمال سننا۔

ایک فرشتہ نے سجدہ کیا اور کہنا شروع کیا۔

بارگشا! اگر ہم اس شخص کا مفصل حال بیان کریں تو وقت ختم ہو جائے۔ مگر بیان  
ختم نہ ہو۔ مسجود حقیقی! اس نے اپنی دلپسند شاعری کے قدیمہ لوگوں کو راقم مستقیم ہے  
ہے سنانے کی کوشش کی۔ میں صرف اُن داستان کو پیش کرتا ہوں جہاں اس نے جنت کا مذاق  
اُڑایا ہے پروردگار عالم سب سے پہلے تو اس نے جنت کے وجود ہی سے نکل کر کیا۔  
اس نے کہا ہے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن

دل کے غم کو کہنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

ایک دوسرے موقع پر اس نے کہا ہے

مناشئ گر ہے زاہد اس قد جس باغ رضواں کی

وہ اک گلہ ستر ہے ہم بخودوں کے طاق نیل کا

اس نے اسی پرکتھا نہیں کیا بلکہ ایک وقت وہ بھی آیا جب اس نے جنت کے

وجود کو تسلیم کیا۔ لیکن اس کی اہمیت اس سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا ہے

کوئی دنیا میں مگر باغ نہیں ہے واعظ

غلہ بھی باغ ہے خیر آب و ہوا اور شراب

اے مسجود حقیقی! جب اس شخص پر یہ یقین ہے کہ اس نے جنت کے وجود کو مان لیا

اور اس نے یہ اعلان کیا کہ اذلی تو مجھے پروا نہیں اور اگر کہیں اس کی خواہش کی ہے تو صرف شراب کے لیے۔ اس نے کہا ہے

وہ چیز جس کے لیے ہم کو ہر بہشت دینے  
سوائے بادہ و گلاب و مشک و لوبکھا ہے

نہا آئی "غائب" !

غائب :- "پروا دگر غائب" !

نہا :- کیا تمہیں اس بیان کی صداقت پر یقین ہے ؟

غائب :- مجھ پر یقین ہے

چڑھے جاتے ہیں فرشتوں کے گلے پر ناحق

آدمی کوئی نہا دم تحریر بھی مست

نہا :- یہ نہ سمجھو کہ تم کہاں ہو۔ یہ میرا انتظام ہے۔ اس میں دخل دے کر سرکشی نہ بنو۔

غائب :- میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہتا ہے

ہیں آج کیوں ذلیل کر لیں ہم نہ سہی پسند

گستاخی فریشتہ ہماری جناب میں .....

نہا :- ہاں ! اس میں بھی میری مصلحت تھی۔

نہا :- کیا تمہاری کوئی خواہش بھی ہے ؟

غائب :- اے امیدوں کے بولنے والے میری خواہش پوری کی جائے گی !

نہا :- بیان کرو !

غائب :- ہے

ناکردہ گنت ہوں کی بھی حسرت کی طے وار

یا رب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے



نہا۔ غائب! یہیں افسوس ہے کہ تم نے ہماری بخشش کوئی ڈانٹ کا تاہباز  
نہا کہہ آٹھایا۔

ایک فرشتے نے آگے بڑھ کر سجدہ کیا اور کہا: ”پودو گارا! اس نے یہیں تک  
بس نہیں کیا اس نے لوگوں کو تعین کی کہ بہشت کو دوزخ میں ڈال دو۔“  
نہا۔ صاف صاف بتاؤ اس نے کیا کیا؟

فرشتہ۔۔۔

طاقت میں تاہے دئے اگلیں کی ٹاگ  
دوزخ میں ڈال دو کوئی سے کہ بہشت کو

نہا۔ کیا اس نے یہ کیا؟

فرشتہ۔ جی ہاں پودو گارا! اس نے کہا۔

نہا۔ تم اس نے لوگوں کو ہماری صیح احاطہ کا راستہ دکھایا۔ اس نے لوگوں کو  
بتایا کہ خالص احاطہ کے لیے بہشت وغیرہ کا خیال نکال دو۔ فرشتہ! اس کو جنت  
میں لے جاؤ۔

فرشتہ۔ بہتر ارم ارمیں!

غائب فرشتوں کی سمیت میں یہ گلنڈے ہوئے آگے بڑھ گئے

کیا جی رضوں سے لڑائی ہو گی

گھر قائلہ میں گر یاد کیا؟

شہزاد کے محلے میں سے نمرہ تحسین بند ہوا۔ صور کی آواز جو مسلسل آ رہی تھی بند ہو  
گئی۔ میں پہلے کراٹھ بیٹھا۔ صحن میں بچے رینگا پھینکا بہا رہے تھے۔ ایک بچے کا  
پکنا پٹ جانے سے یہ خدہ ہوا تھا۔

محی الحق ممدوقی

## مرزا غالب سے انٹرویو

میں: کیا یہ واقعہ ہے کہ آپ کے والد محترم عبداللہ بیگ آپ کی عمر اہل قلم، اہل علم و ادب میں سے نہیں بلکہ اہل سیف میں سے تھے اور ان کا انتقال بھی ایک مہم میں بندوبست کی گول کھا کر ہوا تھا۔ نیز آپ کا سلسلہ نسب شانِ قوراں افراسیاب اور پشتک سے ملتا ہے؟

غالب:۔ سو پشت سے ہے پیشہ آبائے گری

کچھ شاعری فرمائیے عزت نہیں مجھے

میں:۔ مہمان کچھ گاہقہ! میں نے محض انٹرویو کے ضرورت کی غرض سے یہ بات پرچہ لی اور نہ آپ کی شاعری ہی کے بارے میں آپ سے کچھ دریافت کرنا مقصود ہے حقیقت میں آپ کا پورا اردو کلام موتیوں میں توڑنے کے قابل ہے۔ رشید احمد صدیقی نے سچ کہا ہے کہ اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ ہندوستان کو مثالیہ سلطنت نے کیا دیا تو میں بے تکلف تین ناموں گا۔ غالبؔ، اندوڑ تاج محل! آپ کے محبوب کلام کی سی غیر معمولی اہمیت اور مقبولیت آج تک اردو کے کسی دوسرے شاعری محبوب کو نصیب نہیں ہو سکی اردو کے علاوہ دنیا کے بے شمار مستعد زبانوں میں بھی اس کے بے شمار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ آپ اپنے آپ کو ہزار گلشنِ افروز کا

مذہب کسیں نہیں ہمارے اس دور کے ایک مشہور شاعر ملک چند گروم کے بقول ہے  
 گلِ دارِ سخن سے پھول بر چنتے ہیں  
 جہل کی نرا میں تیری لے سنتے ہیں  
 مفہوم ترا کبھ نہیں پاتے ہر  
 وہ بھی تیرے اشعار پر سر دھنتے ہیں  
 مگر خامشی سے فائدہ اٹھائے حال ہے  
 غائب۔ ۱۔  
 خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی کمال ہے

میں۔ ۱۔ آپ کی خوشی ٹکڑیوں پر خصوصاً لیکن اس قہید سے میرا مقصد آپ سے یہ دریافت  
 کرنا ہے کہ آپ کی اپنی نظر میں آپ کے چند ایسے منتخب اردو اشعار کون سے ہیں  
 جو آپ کے شاعرانہ کمال کی پوری نشاندہی کرتے ہیں۔  
 غائب۔ ۲۔ فارسی میں تا بہین نقیض ہائے رنگ رنگ  
 بجز رازِ مجروح، اردو کہ بے رنگ من است

میں۔ ۱۔ لیکن عالی جناب! آپ جسے بے رنگ کہہ رہے ہیں وہ مجروح ہمارے لیے تو  
 رنگوں کی ایک کان سے کم نہیں۔ اس کے تعلق ہمارے ایک ترجمان ناتھ  
 خلیل الرحمن غفلت نے پیش کرنی کی ہے کہ اس شاعری کے ایک سے زیادہ رنگ  
 ہیں جن میں جو زمانہ گزرتا جائے گا۔ اس میں رنگوں کا امتداد ہوتا جائے گا۔ حد  
 تو یہ ہے کہ ملحد ہوں، بصری ہوں یا فلسفی، ہر کسی کے پاس ہوں یا فرائڈ کے  
 پیرو کار بھی کہ آپ کے اشعار کے پتلوں میں اپنے اپنے مفاد کے رنگ جھلکتے  
 دکائی دے جاتے ہیں۔

غائب۔ ۲۔ دلِ حسرت زدہ تھا مادہٴ لغتِ درد  
 کامِ یادوں کا بقدرِ لب و دندان نکلا

ہی۔ ۱۔ لیکن گستاخی سناں اچھا ایسے شاعرین کا کام بھی ہیں جو آپ کے بعض اشعار کو  
بے حسنی قرار دیتے ہیں۔

غالب۔ ۱۔ نہ سائنس کی تہ نہ صلی کی پہوا

نہ سہی گر مرے اشعار میں حسنی نہ سہی

میں۔ ۱۔ آپ نے ٹھیک کہا ہے کہ آپ کے اشعار "اشعار گنجینہٴ رمضانی کے علم" ہیں  
انہیں سمجھنا کارِ عطا نہ نہیں۔ آپ اسے خود میری شروعاتی عطا نہ پر ہی محمول کیجئے۔  
لیکن یہ کہنے کی جہارت قرین بھی کروں گا کہ آپ کے اس قسم کے اشعار

غنیہ شگفتن ابرارِ عافیت معلوم

باوجود دل بھی خوابِ گل پریشاں ہے

یا ہے

بر حسرت گاہ نازِ کشتہ جان بخشی خزاں

خضر کو چشمِ آب بقا سے تر جمیں پایا

مجھے بھی کچھ مبہم سے نظر آتے ہیں اور میرے خیال میں۔ آپ کے چند شعروں  
کا مفہوم اجمالِ اشاروں کی وجہ سے گنگناہٹ ہو گیا ہے جیسے ہے

میکدہ گر چشمِ مست ناز سے پاؤں گسٹ

موتے شیشہٴ دیوہ ساغر کی مژگان کرے

یا ہے

نقشِ ناز بہت عطا بہ اعلاٰ ربِّ رقیب

پاؤں کے عطاؤں سے چنے خاموش مان مانگے

میرے اہام پہ ہوتی ہے تصدیق قرین

میرے اجمال سے کرتی ہے تلویشِ تفصیل

غالب۔ ۱۔

ہیں۔ اس میں کیا شک ہے قہر و کبر! سب  
 سب کہاں کچھ لارہ دہلی میں نمایاں ہو گئیں  
 خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں  
 اور ہے

محرم نہیں ہے تو ہی نہایتے راز کا  
 یاں درخ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا  
 جیسے سدا بہار اور حکیمانہ شعر کہہ کر آپ نے نمود شاعری کے خوانے میں جو  
 پیش ہوا اضافہ کیا ہے اس کی وجہ سے اگر آپ کی شخصیت کو مکمل فخر "اور" پردہ ساز  
 سے تعبیر کیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔

غائب۔ نے مکمل فخر ہوں نہ پردہ ساز  
 میں ہوں اپنی شکست کی آواز  
 میں۔ اللہ اللہ اتنی دل شکستگی اور مایوسی! جو جس طرح آبادی نے آپ کے بارے میں  
 واقعی سچ کہا ہے کہ آج غائب کو پوجا جا رہا ہے کل جب وہ زندہ تھا تو اسی  
 دہلی میں اکثر و بیشتر آدھا پاؤ گوشت اور ایک پاؤ شراب کے لیے ترستا رہا آج  
 ملک کے بڑے بڑے عدوت مند اس کے مزار کی زیارت کے لیے آتے ہیں کل  
 جب وہ زندہ تھا تو اسے خود امراء کے دروازوں پر جانا پڑتا تھا!

غائب۔ زندگی اپنی جو اس طور پر گزری غائب  
 ہم بھی کیا یاد کریں گے خدار کھتے تھے  
 میں۔ غائب اس طور پر زندگی گزارنے کا نتیجہ ہے کہ علم۔ آپ کی شاعری کا غائب  
 رحمان بن گیا ہے۔ جیسے ہے

منصرف مرنے پر جو جس کی امید

نامیدی اس کی دیکھا جا چکے

اور ہے

کہتے ہیں جیتے امید پہ لوگ  
ہم کو جینے کی بھی امید نہیں

اور ہے

جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا  
وہ شخص دن کے رات کو تو گریز ہو  
غم ہستی کا اتد کس سے ہو جز مرگ علاج  
شخص ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے بہک  
میں۔ چلتے موت غم ہستی کا علاج کسی لیکن جناب میں! ہے  
موت کتنی بھی خوب صورت ہو  
زندگی کا کرنی جواب نہیں!  
ہر کس کو ہے نشاط کار کیا کیب  
غائب۔  
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیب

میں۔ غم! تو مر کر آپ نے جینے کا مزا حاصل کر لیا۔ لیکن جیتے ہی کیا صورت رہی

غائب۔ خدا زندگی میں موت کا کھٹکا لگا ہوا

اڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ نرو تھا

میں۔ کیلئے کا کیا سوال مرزا صاحب! موت تو آپ کی زندگی کی بہت بڑی عروسی تھی

اور آپ جیتے ہی بھی کہتے سہے کرے

موتے ہیں آمدو میں مرنے کی

موت آتی ہے پر نہیں آتی

اور ہے

کس سے عروسی قسمت کی شکایت کیجئے  
 ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا  
 یہ فرمائیے کہ اب آپ کی شکایت رنج ہو چکی ہے۔ آپ کیا محسوس کرتے ہیں؟  
 غائب۔۔۔ افسانہ نگار نے واضح صریح برہنہ کی۔  
 میں دہن ہر باکس میں ننگہ وجود تھا  
 میں۔۔۔ آپ نے فرمایا۔ ج

تجھے ہم دلی کہتے جو نہ مادہ خوار ہوتا،  
 ہمارے نزدیک مادہ خوار ہی کے باوجود آپ کی حقیقت کسی دلی سے کم نہیں۔  
 لیکن یہ تو بتائیے کیا شراب سے آپ کی اتنی گہری وابستگی ممکن غم کا رتہ عمل  
 ہے؟۔۔۔

غائب۔۔۔ مے سے غم نہ لٹا ہے کسی دوسیا دگر  
 یک گز بے خدوی مجھے دن رات چاہیئے  
 میں۔۔۔ گستاخی صاف! خنہ بدرا بہانہ بے باقوال بات ہے۔ خیر اس خانہ غراب کے چار  
 میں آپ کچھ بھی کہیے لیکن یہ فرمائیے اب ملک عدم میں اسی دیرینہ مشغلے کی کب  
 صورت ہے؟

غائب۔۔۔ غائب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی  
 پیتا ہوں دہن اب وہ شب مانتا رہیں  
 میں۔۔۔ لیکن ایک دہن باز کش ہونے کے باوجود اور اسی قسم کی باتیں کہنے کے  
 بعد کہ

نہ ہا وہ ارک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے

۵ ہاں جس قدر مے شہدِ مہتاب میں شراب  
 ۵ صرف بہائے مے ہوئے آگاہی کے کشی  
 ۵ بے مے کے ہے طاقتِ آشوبِ آگاہی  
 ۵ قریب کی پیتے تھے مے —————  
 آپ نے یہ شر کو بھوکہ دیا ہے

صحبتِ رنماں سے لازم ہے عذر  
 جائے مے اپنے کو کھینچنا چاہیے  
 غائب :- ترکِ لذت بھی نہیں لذت سے کم  
 کچھ مزا اس کا بھی بھگت چاہیے  
 میں :- آپ نے حسن و عشق کی نہایت نازک کیفیّتوں کے متعلق اکثر نہایت غلط  
 شعریہ ہیں لیکن اس سنگتِ گلی میں ہجر کا ایک گہرا احساس بھی کارفرما ہے جیسے :-  
 کب سے ہوں کیا بتاؤں جہاںِ طرب میں  
 شبِ ہائے ہجر کو بھی رنگوں گر حساب میں  
 کیا محبوب کے وصل سے محروم ہی رہے ؟

غائب :-

یہ نہ تھی ہمدردی قسمت کو وصلِ یار ہوتا  
 اگر اورد جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا  
 میں :- تو گویا وصلِ یار سے محروم رہنے کے باوجود آپ زندگی میں عشق میں مبتلا رہے  
 اور آپ کو یہ احساس بھی ہوتا کہ آپ کے ایسے کام کے آدمی کو عشق نے نکلا  
 کر کے نکو دیا ہے ۔ کہ ایسے عشق سے حاصل ہو ۔  
 غائب :- عشق سے محبت نے زینت کا مزا پایا



درد کی دوا پانی درد کا دوا پاپا  
 میں اور لیکن اب بھی آپ کو محبوب کے وصل کی تڑپ ہے یا نہیں؟ کچھ عرصہ مرنے سے  
 مراد آبادی کی زبان سے یہی سنا ہے  
 عشق مرنے پر بھی نہیں مٹ  
 یہ تعلق ضرور رہتا ہے  
 غالب :- دل میں ذوق وصل و یادِ یار تک باقی نہیں  
 آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھکا جل گیا  
 میں :- آپ کی کافی صبح غزالی کی قبوضات کیجئے گا! آخر میں ایک چھوٹی سی بات  
 اور پوچھنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ اپنی شاعری کو زیادہ سے زیادہ موثر اور متاثر  
 بنانے کے لیے ایک شاعر کو کس چیز کی ضرورت ہوتی ہے۔  
 غالب :- حسنِ ذوق، شمعِ سخن، درد ہے اند  
 پہلے دل گداختہ پیدا کئے کوئی

(غزالی کا ارشاد)



## غالب کا ایک اور شعر،

اُردو بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ نام ہے

یہ جانتا اگر تو نہ تانتا سنہ گھر کو میں

اگر غالب کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اسباب میری غالب کے انحصار کی تشریح  
پر میں مجھ اٹھے، جیسے کوئی کسی دیانت دار کا نظریہ کو دیکھ کر مجھ اٹھتا ہے۔ میں  
ناشری کا شکر یہ ادا کرتا ہوں۔ امید ہے، وہ اسے وہی شکر یہ کہہ کر میری روح  
کو تکلیف نہیں دیں گے۔

آج غالب کا ایک اور شعر تشریح کے ساتھ پیش کر رہا ہوں۔ پہلے سن لیجئے

وہ وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ نام ہے

یہ جانتا اگر تو نہ تانتا سنہ گھر کو میں

اس شعر میں دو کردار ہیں۔ ایک عاشق اور ایک معشوق۔ اُردو کے شعر میں مجھ  
بھی دو کردار ہوتے ہیں اور ان دونوں کے تصادم سے ایک شاعر جنم لیتا ہے۔ غالب  
کے اس شعر میں یہ تصادم موجود ہے۔ اس شعر کا عاشق کان بے وقوف آدمی معلوم ہوتا  
ہے اور معشوق کان بے شہسار، عیار نہ مانہ ساز ہے۔ یعنی یہ ایک بے وقوف اور سادہ لوح  
آدمی کی ایک عیار اور چالاک نفس ہی سے ٹکرا کر کیاں ہے۔ نہانے خدا نے عشق کے

نصیب میں ہے تو ان کیوں کھو دکھی ہے۔

شکر کی گمان یوں بنتی ہے کہ عاشق صاحب نے ایک معشوقہ صاحبہ سے عشق کا آغاز کیا اور پہلی ملاقات پر ہی اعلان کر دیا کہ جان میں! میں تمہاری خاطر اپنا حق، من، دھن، ہمک قربان کر دوں گا۔ عشق کے آغاز میں ہر عاشق کے منہ سے یہ فقرہ نکل جاتا ہے چنانچہ غائب کے ہنر سے بھی نکل گیا ہو گا۔ یہ شعر پڑھ کر ظاہر ہوتا ہے کہ اب غائب صاحب سخت پھبتا ہے جس کو میں نے یہ فقرہ منہ سے کیوں نکالا تھا۔ اگر مجھے معلوم ہو تا کہ یہ فقرہ رسمی نہیں تھا، بلکہ حقیقی تھا اور مجھے واقعی پتہ نہ تھا کہ وہ کیا پڑے گا، تو..... تو..... (شاید میں عشق ہی نہ کرتا بلکہ بزاز کی دکان کھول لیتا۔)

یہ شعر عشق کے آغاز کی ایک ایسی یاد کرتا دکھاتا ہے، جو اب ایک تلخ یاد بن گئی ہے۔ عاشق صاحب مالی طور پر قریب قریب برباد ہو چکے ہیں۔ یعنی آہل مکان عیلام جو چکا ہے، گننا پتا گری رکھا جا چکا ہے، تن پہ کپڑا نہیں رہا، کپڑوں کا کھڑکھڑاؤ رانی کینز کے پاس پڑا ہے اور زحلان کی اجرت ادا نہ کر بھنے کے باعث توپا نہیں ہا سکا عاشقی صاحب تندہ راڈ صاحب پر ہا کر کھانا کھاتے ہیں اور کئی بار ڈھابے کے مالک کے ہاتھ دھتکارے بھی جاتے ہیں

یعنی یہ دو ناگ صورت حالات ہے، جبکہ یہ شکر کیا گیا۔ یہ شعر عشق کی ٹھس منزل پہنچ گیا، جو عشق کا آغاز نہیں ہے بلکہ انجام ہے۔ اور آغاز اور انجام کے درمیان عاشق اور معشوقہ کے تعلقات کی ایک لمبی داستان ہے۔ اور ہر جہ، یہ داستان حسن اور عشق کی نہیں، پیار اور ایثار کی نہیں، بلکہ عاشق اور معشوقہ کے درمیان خالص اقتصادی تعلقات کی داستان ہے کہ عاشق صاحب تو عشق کے دوران اپنا پیرو میلہ بڑھی ذرا خدشہ سے مانتے رہے اور معشوقہ صاحبہ اس سے صرف اس بنا پر محبت جتاتے رہے کہ عاشق کافی سونے مرغی ہے۔ جب تک اس کے پاس مال و دولت ہے، عشق کرتے رہو اور جو نہی عاشقی صاحب

ہیٹ کی آگ، بجھانے کے لیے ایک کیڑا لٹک نہ غریب کیسکیں۔ اس وقت اسے دھتا ہتا رہا۔  
اور اوجر عاشق صاحب یہی سمجھتے رہے کہ میرے ہاتھ کا میل ہے کہ اصل چیز محبت ہے  
یہی اور پاک محبت۔ لہذا تن، امن، دھن ٹا دینا چاہیے۔ تاکہ معشوق صاحب کے دل پر  
یہ خیال نہ جم جائے کہ یہ جینا ہے، کچھ نہیں ہے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ اس شعر میں معشوق عاشق کو دھتا ہتا رہتا ہے۔  
کیونکہ معشوق سب دیکھتا ہے کہ عاشق صاحب تو شعر میں اب دھکے کھاتے پھرتے ہیں،  
کوئی اُسے ٹوکر ہی نہیں دیتا، کوئی کھانا نہیں کھاتا، کوئی بھانڈا اُسے اُدھار کر پڑا بھی نہیں  
دیتا۔ تو معشوق سوچتا ہے کہ ایسے بے رنگ و نام آدمی سے عشق کتنا مفت کی رسوائی ہے  
یہ معشوق کے خاندان و قد کی توہین ہے کہ وہ اس کا عاشق کھاتا پھرتے۔ میرے  
پاس کار ہے، اس کے پاس بس کا کرایہ تک نہیں ہے۔ میرے پاس کوٹھی ہے، اس  
کے پاس کرایہ کا کدو بڑھک نہیں ہے۔ بلکہ دھڑلہ میں پڑا رہتا ہے۔ چنانچہ ایک  
دن معشوق صاحب کو کسی ارڈوس پڑوس داسے نے طعنہ دیا کہ غائب! اُسنا ہے، آپ غائب  
نامی آدمی سے عشق فرماتی ہیں تو معشوق نے عقیدت سے کہا۔ ”نہنہ ایہ منہ اور سرور کی ال! ال!  
جدا ایہ بے رنگ و نام آدمی بھی میرے عشق کا اہل ہو سکتا ہے؟“

چنانچہ معشوق کے منہ سے جو بھی یہ فقرہ نکلا، آگ کی طرح اسے شعر میں پھیل گیا  
کہ معشوق تو غائب کہ بے رنگ و نام کہتا پھرتا ہے اور غائب ہے کہ با اس ہر نام داری  
بد حال، ہر جگہ اینڈ اینڈ کہتا پھرتا ہے کہ وہ ہم سے اور ہم اس سے عشق فرماتے ہیں۔  
غائب نے یہ افواہ سنی۔ کانوں پر قابض رہا۔ کیا کدو غائب ایک آدمی کا معشوق  
تھا۔ وہ عشق کو غلو نہیں سمجھتا کہ جیب میں پیسے جوئے تو غلو خرید لیا۔ دھنہ سرواہ بھر  
کر چمکے سو رہے۔ نہیں، اُسے عشق صادق پر یقین تھا۔ اُسے اقتصادیات زدہ عشق سے  
کوئی واسطہ نہیں تھا۔ اس لیے اُسے اپنے معشوق پر بھی سہرا اعتماد تھا کہ چاہے ساری



# خطوط غالب

(۱)

کمل ہے؛ ذرا یسٹ مرزا کو بلائیے۔ تو صاحب وہ آئے۔ میاں اس سے پہلے وہ خط بھیج چکا ہوں۔ ایک عیدِ ہندی کو دوسرا مہاجانی عاتم علی قمر کو۔ نظر سے گذرے ہوں گے۔ اب میری کہانی سنو۔ میری زبان سنو۔ کل رات جمیعت گذشتہ پڑے پڑے جی گھبرا یا۔ کپ کے جن ہمد کا ذکر پہلے خطوط میں کر چکا ہوں آدمی اچھے ہیں اور ہر اچھا آدمی جو حق حقوٹا بہت چند ہوتا ہے۔ لہذا وہ بے پائے ہی حسبِ حیثیت چند واقع ہوئے ہیں۔ میرے پاس تشریف لائے اور خبر نشان کر آج شہر میں ایک مشاعرہ ہے۔ میں نے سوچا کہ پہل کر دیکھوں تو سہی کہ مشاعرے اب کیسے ہوتے ہیں۔ اے بھائی! اب جو پنپنا ہوں مشاعرے میں تو صاحب کشتہ بہادر دہلی یعنی سائڈز صاحب بہادر کے مبارک نقشہ نگاہوں کے سامنے چر گیا۔ نہ مسند نہ تکیہ، نہ شمع نہ فانوس نہ علم نہ حق سب کرسیوں پر پیر لٹکائے بیٹھے ہیں اور ایک صاحب ایک اونچے سے چوڑے پر کھڑے کلام پڑھ رہے ہیں۔ اور سنو۔ اب مشاعرہ میں شاعر گاتا ہے۔ سننے دیکھنے آہیں بجاتے ہیں۔ حمد میں ہنستی ہیں۔ بچے غل جاتے ہیں۔ میں ایک گوشہ میں بیٹھا ہر اتوبہ استغفار کرتا رہا۔ آج ہر آدمی بھی کام نہیں آیا۔ ایک آکر کے ذریعے آواز کو اتنا اونچا کر دیا جاتا تھا کہ میرا ایسا بھرا بھی ٹھن لے اور من بھی وہ لے جو خدا کسی کو نہ سنائے۔

۴۔ دمن کو ٹھکرا کر دیا ہے۔ چھوٹے بڑے مصرعوں کی فرد تن چٹنی پیش کی جاتی ہے۔  
وہ بھی چٹنی نہیں سیٹھی اور بے مزہ۔ ایک صاحب کے چند

مصرعے یاد رکھئے ہیں تم بھی سن لو۔  
تقداری تھنائے کمنہ اٹھی ہے لہو کی بہاروں کا دامن سنہارے  
بہوں پر بے حیدر نسل و رجت

لگا ہوں میں عذر میں تو کا دامن لا سہارا  
کو تم کو بھی مل جائے پابنگی مسلسل کا قرعہ  
فضاؤں میں گر بجے یہ نعرو

۵۔ مہاراج کی ہے، شہنشاہ کا بخت قائم۔

۱۔ مہاجن یوسف مرزا اعلیٰ بنا دیہ کیا ہے۔ تمام شعرائے فردوس کو سناؤ۔ میر تقی  
میں پانچ۔ نظیر اکبر آبادی شاید کچھ بتائیں۔ انش رکھو روشنی ڈالیں۔ میرا تو دماغ چکر لگا  
اور منہ۔ اس مختلف اہل شاعری کے بعد ایک صاحب نے اعلان کرنا شروع کیا۔  
۲۔ حضرات! اس نظم میں جو دعوت لکھی ہے۔ اس کے لیے صاحبان نکرو نظر کی ضرورت  
ہے۔ اس قوطہ الرجال میں اگر آپ کو ایک بھی صاحب نکرو نظر کسی گوشہ میں مل جائے  
تو فیضت سمجھئے۔ میں آپ کو سراغ دیتا ہوں امر و ہر میں ایک صاحب نظر موجود ہیں۔  
جلد سے اور ڈھونڈ کر لائیے۔ پتہ صرف یہ ہے نظر امر و ہر میں پنہام اگر پہنچ گیا ہو تو نظر صاحب  
امر و ہر میں تشریف لائیں۔

۳۔ صاحب سید من، ایک ذہبان نے اگر غزلی سران شروع کر دی۔ وہ تو خیر شیک  
ہے مگر یہ اعلان کیا تھا۔ یہ بات کیا ہوئی۔ میرے کپ کے ساتھی نے بتایا کہ یہ اعلان  
کرنے والے صاحب دلی سے آئے ہیں۔ اور مشاعروں میں تمناوت کی رسم ادا کرتے  
ہے۔ یوسف مرزا آج معلوم ہوا کہ دلی کیوں دیر ان ہوئی۔ اب بتاؤ اگر کسی کو معلوم

ہو گیا کہ میں بھی دلی والوں میں تو کہیں مجھ کو بھی پکڑ کر مٹا دینی مہربانی۔ میں تو چپکے سے اٹھا اور کھٹک آیا۔ جہاں کبھی لاکھوں پائے۔

یہ خط سب کو سنا دینا۔ اگر خط مرزا ثقت کو لکھوں گا اسے مالک کر پڑھ دینا۔

اُس دنیا سے سنہات کا طالب

غائب

(۲)

اجی مرزا ثقت !

تم میرا میں گناہگار، میں بھی مغلوں تم بھی منچلیے۔ ہم لوگ بھی غضب کے ہوتے ہیں۔ جس پر مرتے ہیں اس کو مار رکھتے ہیں۔ عمر میری ایک بڑی ستم پیشہ دوسری کوئی نے بھی مار رکھا ہے۔ کچھ قتلہ کی کب تک داغ دینے والی ہیں۔ مگر وہ کیا داغ دیں گی آپ کے بھی تو کماں جنت میں جہاں موت کا نشان نہیں۔ غیر چھوڑو اس قصہ کو اب میری سنو۔ پہلے خط میں ایک مشاعرہ کا حال لکھ چکا ہوں۔ آج ایک اور قتلے کا حال لکھتا ہوں آج لکھتا چھوڑا پر چھائیوں کی دنیا میں جانکا۔ چلتی پھرتی، منہ بولتی سر کیسین قصص و ہنر کی بستی میں جس کو یہ لوگ فلم کہیں کہتے ہیں تم پر چھوڑے کو یہ کیا ہے، مگر سمجھاؤں کیا خاک خود۔ یہی کب سمجھا ہوں۔ عجیب شہدہ ہے۔ اسے جہاں پر چھائیاں ہاتھ کرتی ہیں وہاں چن ہیں، ہنستی ہیں، رونے ہیں اور سب ہی کچھ کرتی ہیں۔ بس ہاتھ نہیں آتیں۔ ان دنوں دلوں نے عجیب عجیب فلسفہ ایجاد کر لیے ہیں۔ جو کہیں وہم و گمان میں بھی ڈالتے تھے۔ میرے کپ کے ہمدرد نے فلم کہیں کے مالک سے نہ جانے میرے متعلق کیا کہہ دیا کہ وہ تو بس فرسٹ راہ ہو گیا۔ کہنے لگا کہ ہاں سے بے ٹالنے لکھ دیجئے۔ میں نے فاکو سمجھا یا کہ جہاں میرے گانا گئے میری جا۔ غزال لکھ لیتا ہوں۔ وہ کہہ تو لکھ دوں۔ اس نے کہا جی ہاں وہی اور پھر لگا کہنے۔



”دیکھئے مرزا صاحب - ہمارا پروہب دیکھتا ہے کہ اس کو کسی طرح کامیابی نہیں ہو سکتی۔ کچھ گزربزگشتا ہو گیا ہے۔ اور جس سے وہ محبت کرتا ہے وہ لڑکی اس کو نہیں مل سکتی تو وہ سب کچھ چھوڑ کر نکل جاتا ہے۔ دنیا کو چھوڑ کر دنیا سے لیتا ہے۔ اس جگہ گانا پچھ کچھ بڑا مٹی بھٹی کا ہو گا۔“

”میں خاک سمجھتا اس زبان کو ماننے کے لیے کہہ دیا کہ بھائی میرے اس موقع کے لیے بس یہ غزل ٹھیک ہے۔“

”ہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو۔“

”ہم سن کر کوئی نہ ہوا اور ہم زبان کوئی نہ۔“

”منہ کھول کر دھیل کی طرح منتظر رہا۔“ پھر بولا ”میں مطلب ہے کہ کچھ پایا کھو۔“  
 ”دیکھئے جیسے وہ غزل ہے کہ جب تم ہی چلے پوئیں لگا کر نہیں ترمیم پاتا۔ دنیا میں کوئی تارا۔“  
 ”میں ایک دم چھینا۔“ یہ کیا ہوا۔ کیا بکواس ہے۔ کس سحرے نے کہا یہ غزل ہے اس نے گانا گانے والے استاد کی طرف اشارہ کیا کہ ”یہ ہیں ہمارے میوزک ڈائریکٹر۔“  
 ”ان ہی کی یہ ڈرائنگ ہے۔“ اس شخص نے اور بھی کمال کی بات کہی۔ ”دیکھئے صاحب آپ تو نثر کے چھوٹے بڑے فقرے کھو دیکھئے۔ بس گانا میں خود بناؤں گا۔“ میں تڑپ کر اٹھا اور سر پر پیر رکھ کر بھاگا۔ دیر ہوئی یہاں پہنچے ہوئے سنگھاب بھگدوست طاری ہے اسے جی مرزا کسی طرح کہہ سن کر موت کے فرشتے کو راضی کر لو کہ مجھ کو لے جائے۔ منہ ہے ہے فانی بلالین سے اس کے اچھے مراسم ہیں۔ ان ہی کی سفارش پہنچاؤ۔“

حادثات کا طالع

نواب

”شہرت کا خزانہ“

میر ممدی، خوش زہر۔

آفرین۔ صد آفرین! خدا جانے کب کا بدلیا۔ میں بوڑھا آدمی۔ جھولا آدمی۔ تمہاری باتوں میں آگیا۔ دھوکا کھا گیا۔ پھر اسی دنیا میں آجس جس سے جھانکنے کے لیے زندگی بھر موت کا طالب رہا۔ تم سے رخصت ہو کر مختلف سیاروں میں بھٹکتا ہوا دنیا میں اگردم کیا۔ اور یہ حادثہ دلتی پہنچا۔ مگر ہائے دلتی۔ دلتے دلتی جہاڑ میں جاتے دلتی۔ اب یہاں۔ نظام الدین مسنون کماں۔ فدق کماں۔ موسیٰ خاں کماں۔ دیرانی مسی دیرانی ہے۔ جہاں دلتی تھی وہاں جنگل بیاہاں نظر آیا۔ خدیجیہ سخن مدی رہی نہ سخن دلتی کس برتے پرتا پانی۔ دلتی دالتا اب شہر نہیں، کپ ہے، چھا دلتی ہے۔ نہ قلعہ۔ نہ شہر نہ بازار نہ نہر۔ اپنے مکان کی طرف گیا۔ مگر وہاں کیا دھرا تھا۔

گھر میں خاک کب جو ترا غم اسے غارت کرتا  
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرت تعمیر سو ہے

مگر سچ پوچھو قراب وہ بھی نہیں۔ اس دلتے سے تو ایک ہی دن میں جی اُچاٹ ہو گیا۔ جان لے کر لاہور کی طرف بھاگا۔ راستہ کیونکر کئی جگہ نہ پوچھو۔ یہاں پہنچ کر اب کس سے کہوں کہ میں خجہ الدولہ ہوں۔ مرزا فاضل ہوں۔ اسد اللہ ہوں۔ غالب ہوں۔ وہی غالب جس کے کلام کے مرتعے پختانی بناتے ہیں۔ جس کو دلایت میں چھپاتے ہیں۔ جس کو ہندوستان کی اسلامی کتاب بتاتے ہیں۔ کوئی منہ نہیں لگاتا۔ کوئی بات نہیں پوچھتا۔ ہمارے کس کے ایک کپ میں پڑا ہوں۔ اس وقت دن کے بارہ بجے ہیں۔ میں ننگا ایک کھڑی چار پائی پر پڑا ہوں۔ پہلے کو کرتے یا انگر کھا گلے میں نہیں دھند جو کچھ سوچ رہا ہوں اس کے بعد گریبان بھاڑا انا ضرور دی ہوتا۔  
میں لڑکے اتم نے تو کھاتا کہ میرے لیے دنیا میں جانے کا وقت اب آ گیا ہے۔

غائب کاب دنیا ماروں نے پایا ہے۔ وہ آنکھیں بچائیں گے۔ جان چھڑائیں گے۔ پر جس کے مغراب بتاؤ میں کیا کروں! تجدید حیات کے بعد کیونکر مردوں! پرستاریاں توڑ دینا۔ یہاں تو دور دہائیوں کا بھی سہارا نہیں۔ شراب کیسی پانی دینا کسی کو گوارا نہیں۔ کچھ معلوم ہی ہے میاں صاحب زادے اشاعری سے زیادہ انشاں کراچ کل کوئی شغل نہیں جس کو دیکھنے ایک شخص لیے چھرتا ہے، اور اشاعری کا دم سبوتا ہے۔ اشاعری کے نام سے خرافات کے دریا بہائے جا رہے ہیں۔ اپنے کو شاعر کہتے بھی شرم آتی ہے۔ جو دبائے عام میں کمنے سے بھاگتا تھا اس کی قسمت میں دبائے عام کی یہ زندگی نکلی ہوئی تھی۔ یہ حال دیکھ کر شعر کہنے سے قہر کی۔ اصلاح دینے سے قہر کی۔ شعر سننا تو ممکن نہیں بہرا ہوں شعر دیکھنے سے جی مٹتا ہے۔ پندرہ برس کی عمر سے پچھتر برس کی عمر تک پہلے شعر کہتا رہا۔ یعنی پہلے سا سو برس بکتا رہا۔ پھر عالم بالا میں سب جمع ہو گئے تھے تو کچھ شغل رہا۔ مغراب تو یہی جی چاہتا ہے کہ لوگ مجھے زمرد شعرا میں شمار کریں اور اس فن کی کسی وجہ سے پُرسش نہ ہو۔ مگر زندہ رہنا ہے تو کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ اب اللہ جلے کیا کرنا پڑے گا۔

ایک ہمدرد نے راتے دی ہے کہ ریڈیو جاؤں اور فلم کمپنیں کو سونگھوں۔ سن ہے کہ کراچ کل شاعروں کی اگر کمپت ہے تو ان ہی مقامات پر ہے۔ اب خدا جانے یہ ریڈیو کیا جا ہے اور یہ فلم کمپنی کیا تماشہ ہے۔ غیر میرا کیا ہے اندازہ کرنے کے لیے کبھی چلا جاؤں گا بیکار تو پڑا ہی ہوں۔

مجتہد العصر میر سرفراز حسین اور ذاکرالحسین، میر افضل علی عرف میرین صاحب کو دعا۔ مرزا ساقی علی قمر کی کئی محمدیہ اعلان ملے تو کھلا دینا کہ انکا خطا انہی کو کھوں گا۔ میرا یہ خط ان کے علاوہ مرزا علاؤ الدین خاں علانی، حکیم مومن خاں مومن، میرزا افتخار، سید رفیع مرزا، قادر بگراہی، حکیم غلام نجف خاں وغیرہ کو سننا دینا۔ میرین صاحب کو دعا۔

میر تقی میر کی طرٹ جانا تو میرا سلام لے کر جانا اور میرے لیے دعائے موت لے کر آنا۔  
 از سرِ زحمت کا طالب

غائب

(۴)

اے سبائی سرنا خاتم علی صاحبِ تہر  
 تم کو دیکھنے کے لیے تڑپتے تڑپتے تم سے باتیں کرنے کو بھی چاہئے لگاؤ باتیں کہیں  
 ادمیر بیٹھو میرے قریب۔ ہاں یہ۔ اپنے پسینے اور دلی سے لاہور بھاگ آنے کی اطلاع  
 قرۃ العین میر جہدی کو دے چکا ہوں۔ خدا جانے ہنسنے ہوں گے یا روتے ہوں گے اچھا  
 اب سنو کہ پھر کیا ہوتی۔ جن ہمدرد کا میں نے کچھ خط میں ذکر کیا ہے۔ ان کے مشاعرے  
 سے ریڈیو گیا۔ صاحب میرے ے

خار انگشت بدنداں کر اے کیا لکھتے

ناظرے سرگرمیاں کر اے کیا کہتے

یہ عجیب جادو لگا۔ سرِ جہاد کر رہنے والا جادو۔ اس کے ذریعہ گھر بیٹے ہزاروں  
 میل کی آواز سن لو۔ باتیں سن لو۔ اپنی سنانا ہے کسی کی سنتا نہیں۔ میں تو سمجھا تھا کہ ہوا  
 ہونے کے بعد یہ وصف صرف مجھ میں ہے مگر اس کو دیکھ کر تو میں نے بھی کالوں پر  
 ہاتھ رکھ لیے۔ حقیق کی طرح ایک چیز کرے میں رکھی ہوئی ہے اس کی چلم کے قریب  
 منہ لاکر بولے بس منہ سے بات نکل اور الم نشرح ہوئی۔ جن گھروں میں وہ صندوقِ قہر سا  
 رکھا ہوا ہے جس میں یہ آواز پہنچ جاتی ہے۔ وہاں جہاں کی آواز چاہیے سن۔ سمجھے۔ ایک  
 سے ایک گانا۔ ایک سے ایک بیان اور تو اور سنا ہے کہ مشاعرے تک اس ریڈیو  
 پر بولہ بولتے ہیں اور یہاں کے مشاعرے سات سمندر پار دلایت والے بھی سن سکتے ہیں  
 عقل حیران ہے کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ کبھی میں نہیں آتا کہ یہ کیا ماقوس ہے۔ جہانے کو تو نہیں

چلا گیا مگر اب پریشان کرئیں یہاں کس مرض کی دعا بن سکتا ہوں۔ اُن ہمدرد نے تھوڑے  
 کی رسم دعا کی۔ اُس سر سے بے اُس سر سے کھک غائب آیا غائب آیا کی دھوم مچ گئی۔  
 معلوم ہوا کہ یہ کوئی معمولی جگہ نہیں بلکہ باقاعدہ سرکاری عمارت ہے۔ اس عمارت کے انصر اعلیٰ سے  
 اس فقیر کو بلا گیا۔ بڑی گرم چوٹی سے ملے اس عمارت کے متعدد محل کرنے لگے۔ اپنی  
 میز کے نیچے خدا جانے کس جن کو گھما دیا کہ ایک دیوار نہایت میٹھی آواز میں مجھ کو میری  
 یہی غزل سناتے لگی ہے۔

ہر ایک بات پہ کہتے ہر دم کو تو کیا ہے  
 تمہیں بتاؤ یہ انداز گفتگو کیا ہے

اے مہمان! میرے تو ہاتھ پاؤں چول گئے۔ جلدی جلدی آیت الکرسی پڑھنا شروع  
 کر دی۔ جانتے ہو کہ آسیب سے میرا نقشہ کیسا سہن ہوتا ہے۔ میں سمجھا کہ جو کچھ ایسا ہی  
 نکل ہے۔ مگر جب اُن انصر اعلیٰ نے گھما پھرا کر دکھا جھٹکا کر سمجھا یا تو بارے جان میں  
 جان آئی۔ محفل کو چپ کر میں رہی مگر دل ٹھہر گیا۔ معلوم ہوا کہ اس ریڈیو پر میری غزلیں  
 بہت گائی جاتی ہیں۔ مجھ سے تندرہ کلام کی فرمائش ہوئی۔ میں موقع نصیحت جان کر مطلب  
 پر آ گیا۔ عرض کیا کہ پوریسی ہوں۔ بے سہارا ہوں۔ جنت کو چھوڑ کر اس مہم پر دنیا میں  
 آ گیا ہوں کہ میری غائبانہ پرستش کرنے والے شاید اُس کس مہم کی تعانی کر دیں جس کا  
 داغ لے کر مر رہا تھا۔ مگر فی الحال تو روزوں کی نوبت ہے اور روزی دیکھا ہے۔

اس عمارت کے انصر اعلیٰ نے نہایت خندہ پیشانی سے بڑے میٹھے الفاظ میں کہا۔

”بیشک۔ بیشک۔ اگر یہ خدمت آپ ہمارے سپرد کر دیں تو نہ ہے نصیب۔“

عرض کیا۔ ”میں تکلف چھوڑ دوں گی کہ سکتے ہو تو پچھ پچھ کر نہ کرو۔“

ان صاحب نے سراپا اخلاق جگر فرمایا۔ ”آپ ہمارے یہاں اسٹاف آرٹسٹ

ہر جائے۔“

پوچھا۔ ”وہ کیا بنا جاتی ہے؟“

ایک درباریہم سے بولے۔ ”یہ ایک طرزست ہے اور اس کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ آپ قرآن کو طرزست سمجھتے مگر ہم آپ کو طرزست نہ سمجھیں گے۔“  
حیرت سے پوچھا۔ ”یہ کیا بات جاتی ہے۔ ہم سمجھیں اور آپ نہ سمجھیں۔ اس میں نا سمجھی کس کی ہے۔“

کھنکھائے۔ ”قبول بات یہ ہے کہ یہ طرزست سے زیادہ ایک قسم کا ٹھیکہ ہے۔“  
کریم ٹھیکہ پر آپ کا دماغ لے لیں گے اور اپنی ضرورت کے مطابق اس کو پھرناتے رہیں گے۔ ظاہر ہے کہ کچھ دنوں کے بعد اس دماغ کا جو ہر قہار سے پاس آ جائے گا۔ اور پھر آپ کے پاس رہ جائے گا۔ اس وقت ہم حسب شرائط معاہدہ چندہ دن کا نوٹس دے کر یا اگر آپ ایسے ہی غشش رہے تو چندہ دن کی تنخواہ دے کر آپ کو رخصت کر دیں گے۔“

عرض کیا۔ ”یعنی دماغ کا سارا مرقع نکال کر بس رخصت کر دیں گے۔ اور تاہمیں ذکر میں گئے کہ اپنی نظرانی میں کسی پاگل خانے میں کم سے کم داخل ہی کرا دیں۔ یہ کہاں کی مرقت ہے؟“

وہ حضرت مذاق سمجھ کر ہنستے ہوئے بولے۔ ”بہت خوب فرمایا۔ مگر کیا عرض کیا جائے اس قسم کی طرزست کی شرطیں ہی کچھ ایسی ہیں۔“

پوچھا۔ ”یہ جتنے سیاسی طرزست ہیں سب ان شرطوں پر ماضی ہیں؟“

وہ بولے۔ ”جی نہیں، سب طرزست اس قسم کے نہیں ہیں۔ چونکہ دماغ کوئی مستقل چیز نہیں ہے۔ لہذا مستقل طرزست صرف وہ ہیں جن کے دماغ سے ہم کو کوئی سروکار نہیں اگر دماغ ہے تو سبحان اللہ وہ نہ کوئی مضائقہ نہیں اکتسابی سند ہی کافی ہیں۔ ان میں بھی بہت سے اہل دماغ ہیں۔ مگر یہ ایک اضافی خصوصیت ہے جو عموماً رنگ آمیز ہے۔“

کر رہا تھا ہے۔ البتہ وہ لوگ جو صرف اہل دماغ ہیں اور فن کار ہیں ان کو مستقل ملازم رکھنے کے بجائے اسی قسم کا مارضیٰ معاہدہ کیا جاتا ہے۔

معوض کیا۔ مدسٹوم نہیں یہ آپ فن کار کی عزت کرتے ہیں یا بے عزتی۔ قدر کرنے ہیں یا تقدیری۔“

وہ صاحبِ برے۔ اس سے بڑھ کر عزت اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہم ان کو باقاعدہ ملازم رکھنے کی جرات نہیں کرتے۔ اس سے بڑھ کر اور قدر کیا ہوگی، کہ ہم ان کو بعض صورتوں میں سرکاری ملازموں سے زیادہ تنخواہ دیتے ہیں۔ البتہ چونکہ فن کاروں میں ایک قسم کا خدشہ سا ہوتا ہے۔ لہذا ان کے اس پندار کو توڑنے کے لیے ہم بڑے سے بڑے فن کار کو چھوٹے سے چھوٹے سرکاری ملازم کے ماتحت کر دیا کرتے ہیں۔ معوض کیا۔ ”گویا تمہو کو بھی اسی قسم کے لوگوں کی بات سن کر نا ہوگی۔“

آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولے۔ ”یہ بات تو بے قبو۔“

میں نے گفتگو کو انتہا تک پہنچانے کے لیے غصہ کر ضبہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اور کام کیا کرنا ہوگا تمہو کو؟“

کہنے لگے۔ ”مزایں کہنے رہ پیئے، منظر موندائے لکھئے۔ بچوں کے لیے چھوٹے چھوٹے گیت لکھئے اور ہمارے میاں جو گانے ملے اور گانے مایاں آتی ہیں ان کے تلفظ درست کرایا کیجئے۔“

پوچھا۔ ”اور تنخواہ کیا ملے گی اس سہات کے طالبِ غالب کو؟“

کچھ سوچ کر بولے۔ ”ہم آپ کو ساڑھے تین سو لکھ دے دیں گے۔“

حیرت سے پوچھا۔ ”خشک، غلغلوں کے علاوہ؟ سو صاحبِ اتم ہانتے ہو کہ پیش گو

حضرت سلطانِ عالم سے بھی میں غلغلوں پاتا رہا ہوں۔ جو وہ پارچے کا خلعت ایک بار، اور میرے خاص شالِ مدلل دو شلہ اکثر اوقات۔ لہجہ کو اس کی عادت پڑی ہوئی ہے۔“

”وہ صاحب ہوئے۔ یہ قبلہ غلامتوں کا زمانہ نہیں۔ اب تو بس تخراب ہی تخراب ہے۔“  
 اب میں نے صاف صاف سنا ”میں ہوش کی خبر لو۔ کس دسیان میں ہو۔“  
 کس خیال میں ہو۔ تم سارے تین سو روپے میں غائب کو فریاد چاہتے ہیں۔ اس کے  
 دماغ اور اس کی دماغ داری کے دام لگاتے ہو۔ یہ دماغ ابھی تو ایسا گھبرا نہیں  
 کہ نیکام پر چڑھا دیا جائے۔ میں تو تم کو ہرگز رہا تھا۔ ٹھنڈا رہا تھا۔ ٹھنڈی کر رہا تھا  
 معلوم ہو گیا کہ تم سے نزدیک میں کتنے پانی میں ہوں۔ بجٹھ لو۔“

وہ خدا جانے کیا کیا سمجھتے رہے کیا کیا فرماتے رہے مگر میں سیدھا سبھا لاپٹے کپ  
 کی طرف۔ اپنے کو بڑا بھلا کہتا ہوں اگر کہیں آگیا تھا یہاں۔ عزیز گرامی میری مدد میں تو کہہ  
 دیجئے گا کہ ہاں یہاں ’غائب‘ ہو رہی ہے۔ قدر دانی۔ واقعی بھول تمہارے اہل فتنے کا زمانہ  
 ہے۔ چھپتے ہیں میرے ڈار کوئی پوچھتا نہیں اور پوچھتا ہے تو اس طرح جس طرح کا حال  
 تھا۔ خدا اس پر چھپنے سے بچائے۔ خدا کسی غیرت دار کو یہ دن نہ دکھائے۔

یہ خط بھی سب کو دیا۔ اور سنا دیجئے گا۔ کاش پھر سب اک جا ہوں۔ ہے  
 ہے کیونکر اک جا ہوں۔ دیکھئے زمانہ اور کیا کیا دکھائے۔ کس کس کی خاک چھنوائے۔  
 سید پرست مرزا علی تو مزاج پرسی کر لیجے۔ معلوم نہیں اب ان کی خارش کا کیا حال ہے  
 اس بندہ خدا نے جنت میں بھی خارش کو نہ چھوڑا۔ اگلا خط انہی حضرت کو لکھوں گا اور  
 نازک مزاج ہیں ناراض ہو جائیں گے۔

آپ کی غیرت کا غائب

غائب

شوکت مزاری



## کلام غالب کی نئی شرح

کسی دل جلے شاعر نے کہا تھا — اور شاید بڑے تلخ تجربہ کے بعد کہا تھا کہ ”شعر مراد..... لیکن اسے کیا کہا جائے کہ شعر کو مدرسے اور مدرسہ کو شعر سے معز نہیں قصود اس میں مدرسہ کا ہے نہ شعر کا۔ آخری ذمہ داری بہر حال نصاب، بنانے والوں پر آتی ہے اور جس طرح ”نصاب“ کسی شب نسب کا پابند نہیں ہوتا، نصاب بنانے والے بھی اپنے آپ کو کسی قاعدہ قانون کا اسیر نہیں سمجھتے البتہ وہ شاعروں اور فنکاروں کو ”نصابی کتابوں“ میں مصدور کرنے پر ہمیشہ معزز رہتے ہیں۔ ہر زبان میں کچھ شاعر اور ادیب ایسے مزود ہوتے ہیں کہ نہ تو نصابی کتابیں ان سے چھٹکارا حاصل کر سکتی ہیں اور نہ وہ نصابی کتابوں کی زد سے بچ کر نکل سکتے ہیں۔ اردو زبان میں بھی غالب ایک ایسا ہی ناگزیر شاعر ہو گزرا ہے جو اپنے صدیقی بھائی ناگزیر تھا اور آج بھی ناگزیر ہے۔

غالب نے صرف شعر ہی نہیں تخلیق کیے حال کر بھی تخلیق کیا اور پھر حالی نے یادگار غالب تخلیق کی اور یادگار غالب نے بھنوری - طہاٹائی - حسرت - آستی - شہنا - بے خود - غلام رسول قمر - اکرام - امک - رام - قاضی عبدالودود - علی شزار - جعفری اور عرشی راہپوری وغیرہ کو تخلیق کیا۔ یہاں ہم کہ تخلیق کے اس سلسلہ ”وراثہ کاسرا“ نئی پود کے لہر میں آیا اور قدرت نے ایک نیا گل کھلایا یعنی غالب نے وہ جو کہا تھا:

مکن ہوتا ہے مراد سنگن حقیقی ۱۰

سوا یک صدی بعد مرحوم نے اس کا جواب پایا۔ ایسا جواب چاند عاقی سے بن پڑا تھا اور نہ بھنوری سے نہ ملکا جانی سے نہ حسرت سے نہ بے خود سے اور نہ آسی سے بن پڑا تو اردو کے ان باکمال دانشوروں سے جن کی مادری ہی نہیں پوری زبان بھی اردو ہے جو کالجوں میں پڑھتے ہیں اور فارغ التحصیل ہو کر کالجوں میں پڑھاتے بھی ہیں۔

اردو زبان و ادب کے ان تازہ دار و نمائندوں نے کلام غائب کو جو ان کا رنگ روپ عطا کیا ہے اور فکر غائب کو جو نیا موڑ دیا ہے اس کے کچھ نمونے حاضر ہیں تاکہ ادبی الابصار، پتلے قرآن سے بصیرت حاصل کریں پھر جی چاہے تو ہجرت بھی حاصل کر لیں غائب کی ایک مشہور اور سہل متغنی غزل کے اشعار ہیں۔

ابن مریم ہوا کرے کوئی میرے ٹکڑے کی دوا کسے کوئی  
شرع و آئین پر مدار کسی ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی  
کیا کیا خضر نے سکند سے اب کسے رہنا کرے کوئی  
جب ترقی ہی اٹھ گئی غائب کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

ان اشعار کی گونا گوں تشریحوں میں سے صرف چند تشریحیں پیش کی جاتی ہیں۔

”قیاس کن رنگستان میں بہار مرا“

اپنی طرف سے صرف اتنا تصرف کیا گیا ہے کہ زبان کو قراء کا پابند بنادیا گیا ہے۔ اور نئے اطلاق کی جگہ پڑانے املا کو استعمال کیا گیا ہے اس کے جرات بے جا اور مداخلت اردو کے لیے ہم اپنے نوجوان شاعرین سے معذرت خواہ ہیں، پتلا شعرو۔ ابن مریم ہوا کرے کوئی۔

”ابن مریم سے مراد حضرت عیسیٰؑ جو مردوں کو جلاتے تھے اس لیے غائب کہہ رہے ہیں کہ کوئی معذرت عیسیٰؑ کو ہائے۔“

ایک اور حیرت انگیز معنی نیز تشریح :-

ابن مریم کا مطلب ہے مریم کی بیٹی۔ یہاں یہ مراد ہے کہ مریم کی بیٹی کی طرح۔ غالب اپنی محبوبہ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ وصل کی وجہ سے شاعر غالب کو تکلیف یا صدمہ ہے۔ اس دکھ کی دوام جائے۔ مطلب یہی ہے کہ ملاقات یا وصل۔

یا بھرو۔ اس شعر میں غالب کہتے ہیں کہ مُردوں کو زندہ کر دینا آسان ہے۔ جس طرح حضرت عیسیٰؑ مُردوں کو زندہ کر دیا کرتے تھے، مشکل تو یہ ہے کہ یہ مریض جو مجھے محبوب کی طرف سے ملا ہے اس کی دوا کرنا، ممکن ہی نظر آتا ہے انہی کا ایک اور شعر ہے۔

تشریح کا ایک اور نمونہ :-

اس شعر میں غالب نے بی بی مریم کی طرف اشارہ کیا ہے۔ غالب دو دُغم میں بھرپور ہیں، جس طرح حضرت عیسیٰؑ کسی مردہ چیز کو مارتے تو وہ فوراً اُٹھ کھڑی ہوتی اسی طرح سے مریم کی طرف اشارہ کر کے یعنی اپنی محبوبہ کے سامنے رورہے ہیں۔

اور پھر یہ تشریح بھی ملاحظہ ہو :-

حضرت مریم کے لڑکے عیسیٰؑ مسیح نے مردہ لوگوں کو پھر سے زندہ کرنے کی قوت پائی تھی لیکن شاعر ذریعہ بحث یہ کہنا چاہتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ مسیح بھی کوئی بہن گئے اور غالب صاحب کے دکھ کسے لیے دوا کرتے ہوں گے لیکن ابن مریم نے بھی اگر میرے ان ذلیت یعنی زندگی کے دکھوں اور دُخوں کو دور کرنے یعنی چنگاکنے کی شافی ہے تو شافی میرا کوئی کیا کرے گا۔

رہے چاہے آپ کا کوئی کیا کر سکتا ہے

ہمرا شاعر۔ مشاعرہ انجمن پرمدار سہمی ۱۔ الخ

شارح کی جہتِ طبع اور ندرتِ فکر کی داد دیجئے۔

مشرح سے مطلب ہے اور آئین سے مراد ہے آئینہ۔ غالب کہتے ہیں میری

محبوبہ بیٹہ آئینہ کے سامنے بیٹھ کر اپنی ہی اداؤں کو ادا اپنی ہی نظروں کو دیکھتی ہے۔  
 اور کبھی کبھی ایسی نگاہوں سے اپنے محبوب کو (پردہ سے) دیکھتی ہے کہ اگر نگاہوں کے  
 تیر محبوب پر پڑ جائیں تو وہ قتل ہو جائے۔ اس لیے ایسے قاتل کو ہم محبوبہ کو ادا اپنی نیم باز  
 آنکھوں اور نگاہوں سے قتل کرتی ہے کوئی کہہ نہیں کر سکتا اس لیے غائب نے ایسے  
 اور شعر بھی لکھے ہیں۔

غائب نے قریبے شعر اور بھی لکھے ہیں گے لیکن ایسی شرح صلا اور کن کر سکتے ہیں۔  
 ایک اور قاتل انداز تشریح۔

اس شعر میں غائب اپنے محبوب کی طرف غائب ہے جو قاتل ہے۔ غائب کہہ  
 رہے ہیں کہ میرا محبوب اگر شروع میں اکھاڑے یعنی گردش کے زمانے میں کہنے، غم کے  
 زمانے میں کہنے یا خوشی کے زمانے میں کہنے میں بدداشت کر دیں گا۔ مگر میرا محبوب ایسا  
 ہے جو وعدہ کرتا ہے مگر ادا نہیں۔ یعنی محبوب وعدہ پر ڈاکا ایک قاتل بن گیا ہے۔ اس  
 غزل میں غائب نے ہر جگہ کہے کوئی نہ لکھا ہے جس کے معنی ہیں انتہا اور خواہش۔  
 (جتنے اب کیا کہے کوئی)

اور اب اس تشریح پر سر و صنیے۔

اس دنیا میں انصاف کے لیے دو قانون مقرر کیے گئے ہیں (۱) شرح (۲) آئین  
 لہذا اگر کوئی منہ کاٹے یا قاتل جو کہے تو سب بلا سزاؤں میں سے کوئی ایک سزا دی  
 جاتی ہے۔ غائب کہتے ہیں کہ ہمارا قاتل جو ہم سے وعدہ ہے یعنی وعدہ کر رہا ہے ابھرتی ہوئی  
 اٹھیں اور اٹھوں کو غم کر رہا ہے۔ تو اسی لیے اس سے غائب ہو کر غائب کہہ رہے  
 ہیں کہ اسے مشوق افسانہ کی اس حالت پر تمہیں کیا سزا دی جائے گی۔ یہ کہنے سے قاصر  
 ہوں کہ تمہیں کوئی سزا دی جائے گی۔ واقعی میرے قاتل کی حالت بہت بُری ہے  
 ایک اور لڑکا مطلب۔

مرزا غالب اس شرمی ذاتے ہیں کہ میرا محبوب شرع و آئین کا اتنا پابند ہے کہ کسی اور چیز میں دلچسپی نہیں رکھتا اور رسوم و عادات کے حار پر مبنی ہے لیکن باوجود اس کے وہ اتنا بے حس ہے کہ کسی اور کے حالات کی خبر ہی نہیں رکھتا تبس مرزا فرماتے ہیں ایسے قاتل کا کیا علاج کریں کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ غالب اسی حادثہ سے بچنے کے لیے غالب نے یہ لکھا تھا اور قن کی جی کر۔ کچھ نہ کچھ خدا کرے کوئی " اور اس پر اب بھی کو بھی دیکھیے۔ " اس شرمی غالب نے اپنے محبوب کی شکایت کی ہے۔ ان کا کہنا ہے دنیا میں ایسے بھی لوگ ہیں جو ایک دوسرے کو قتل کرتے ہیں لیکن میرا دوست ان باتوں سے بے خبر ہے البتہ کبھی کبھار وہ بھی اپنی نگاہوں سے مجھے قتل کرتا ہے۔ ایسے قاتل کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

(اور نہ آپ کا کچھ بگاڑ سکتا ہے)

اختر حسن





## پولیشکل مشاعرہ برطانیہ

جرمنی کیا ہیں ترک ہیں کیا مال      آسٹریا میں اب رہا کیا ہے  
اٹھتے ہیں میں مرے ہوائی جہاز      برق کیا چیز ہے ہوا کیا ہے  
اب تو امریکہ جی ملا آ کر      میری قوت کا پوچھنا کیا ہے

## فرانس

کیا بتائیں کو کیا گذرتی ہے      حال بیمار و مینا کیا ہے  
میں دھشت پر پڑ گئی ہے خاک      کیا کہیں زیت کا مذا کیا ہے  
ہم نے مانا کہ ہم ہی جیتے ہیں      مگر اب آگے جانے کیا کیا ہے  
دیکر کیا ہوٹلوں کی رونق کا      توں کتنی کا تذکرہ کیا ہے  
مجو کو جو کچھ ہے بل وہ برٹش کا      درد اب لمبیں صمد کیا ہے

## امریکا

آؤ آؤ تو بلا مجھ سے      جرمنی تیرا صمد کیا ہے

آگے بڑھ جاؤ اب قرہم جانیں دم دبا کر یہ جہان کی ہے

### جاپان

کچھ غرض بھی نہیں ہے یاروں کو ساتھیر یا میں اب دھوکا ہے  
 نئے نئے دے لوں مجھے کب کام اس زمانہ کا دم کی ہے  
 منتہائے مال میں جانب مال و دولت کے ماسوا کی ہے  
 تنزد مشق تجارتِ انبیا ماسوا اس کے انڈیا کی ہے

### جرمنی

جان پر آجی ہے کیا کیجئے پوچھتے کیا ہو، مورد کی ہے  
 اس کو مار دو تو دوسرا موجود یا الہی یہ صاحب کی ہے  
 کوں کہہ دے کہ صلح ہو جائے دھاب لہو میں رہ گیا کی ہے

### جرمنی کی ڈینگ

پھر بھی ان سب کو کیا سمجھتا ہوں شیر بجری کا سانا کی ہے

### آسٹریا

اس قدر دشمنوں کا خیز ہے موت بھی اپنی لے خدا کی ہے

### حک

ماننے مرنے کو ہی ہم موجود کیا کہیں دل میں اور کیا کی ہے







## طرح غالب

جہزی کی چستی کو شاعروں نے کب پایا  
 شاعری کا اعرابی اونٹ پر چڑھ پایا  
 شرح کا اثر ایسا طرح میں گھب پایا  
 جو ڈھما دھمک اعلان بھی اسکو بے شرا پایا  
 حق یہ ہے ڈھالی تے گا کے کب مڑا پایا  
 ہل اٹھا رہا نہ ہم نے دعا پایا  
 "وٹ پر چڑھے جب ہم اور منہ سے کچھ بولے  
 شعریں ہوا سوزوں جیسے کچھ پڑا پایا  
 طرح کیا کر گھنیا ہے بحر کیا کر لغو ہے  
 نظم کے لیے بیٹھے ایک عارض پایا  
 وزن کی لگی ٹھوکر ہو گئی زبان سنگری  
 شعر کہہ کے یہ ہم نے درد لا دیا پایا  
 شاعری کے سر پہ آن اُسے بھی پڑھے موندوں  
 طرح نے جمیت کو ادھر بھی جرات آڑا پایا

اسی طرح چوب دار سڑ سے بے شکا  
 کھا گیا تھا ہانسی اس سے نارب پایا  
 . ظریف گر پانی اب کی سال کم ہوسا  
 تو بھی مثل مینڈک کے شعر گڑتا پایا  
 ظریف گھسٹوئی

اردو پینچ ۳۰ جنوری ۱۹۰۵ء



دم یا تاز قیامت نے ہنوز  
 پھر تراقت سوز یاد آیا (غائب)

## فرمودہ غالب

مہری اپریل کونسل کی کچھ مشکل نہیں  
 دھڑ تو دل جائیں گے یہ بھی ٹوٹ چکے کیا؟  
 میرزا غالب خدا بخشے کہ یہ فرما گئے  
 ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھا چکے کیا؟

علامہ اقبال

————— ❦ —————

## مجنوب کی بڑ

ہائے داسے کبھی کافرو دیندار نہیں  
 گشتیاں لڑتے ہیں اب ہاتھ میں تلوار نہیں  
 فاقہ مستی میں یہ ہر حق کو الٹی قرب  
 فٹو ایسا کو اُترنے کے کچھ آثار نہیں  
 سب اسیرانِ قلعہ گاتے ہیں جیادگان  
 کھن اس بھول جلیان میں گرفتار نہیں  
 کشنِ دل ہے کہ باز بچہ طوفانِ بوس  
 دور تک ساحلِ امید کے آثار نہیں  
 لائے گی غفلت امروز قیامت کی خبر  
 بہت بیدار کہاقتن بھی بیدار نہیں  
 اپنا گھر اپنی زمین اپنا غلام بیگانہ  
 آتش کوئی بجز سایہ دلدار نہیں  
 دقت کی بات ہے دقت آئے تو سب آسان  
 مسل تو مسل ہے دشوار بھی دشوار نہیں

بردا کرتا ہوں کبھی کتا ہوں دُعا  
 یاں کیا کیجئے جب اُتار میں توار نہیں  
 بک گیا ہوں جنوں میں کیا کب  
 کچھ نہ سمجھتا کھڑے کون  
 دیگاز چنگیری



غائب قراۓ احوال نہادیں گے ہم ان کو  
 وہ سُن کے بُلا لیں یہ اجاہد نہیں کرتے  
 (غائب)

## غالباً غالب

ویران غالب سے مرتب کیا ہوا ایک خاکہ جس میں سوائے ایک لفظ "کون" کے  
باقی سب کچھ کلام غالب ہی سے ماخوذ ہے۔ منتظر ہے کہ غالب کا دسی رات کو گھر میں داخل  
ہوتے ہیں جہاں بیگم ان کے انتشار میں بیٹھی چائے کاٹ رہی ہیں۔  
غالب (دراصل جوتے ہوئے)

دل چہرہ و ان کوئے علامت کر جائے ہے  
پندار کا صم کہہ دیراں گئے ہوئے  
بیگم۔ (چنگ کر) کون —؟

غالب۔ ۱۔ پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے

کوئی تلوڑ کہ ہم بستہ نہیں کیا  
ہوں تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی بنا  
بیگم۔ (منز سے)

آپ آتے تھے سڑ کوئی "عناں گیر بھی بنا  
لاکھوں نگار ایک پرانا نگار کیا  
غالب۔ ۲۔

لاکھوں بناؤ ایک بگڑا حباب میں  
غالب۔ ۳۔ ہمیں نہ چھیر کہ بس جو شکر اٹک سے



- بیٹھے ہیں ہم تہمتہ طعناں کیے ہوئے  
 غالب :- ہم سے کھل جاؤ ہرقت سے پرستی ایک دن  
 درخ ہم چھریں گے رکھ کر غلامی ایک دن  
 بیگم :- پرہیز میں شکوہ سے ہر رنگ سے جیسے باہر  
 اک نرا چہرہ اپنے چہرہ دیکھئے کیب ہوتا ہے  
 غالب :- میں انہیں چھریوں اور وہ کچرہ کہیں  
 چل نکلتے جھٹے چٹے ہوسنے ،  
 بیگم :- میری قسمت میں غم گراتے تھے  
 دل بھی یارب کئی دیتے ہوتے  
 غالب :- (سجیدہ ہو کر) بار بار دیکھی ہیں ان کی رنجشیں  
 پر کچے اب کے سرگمان اور ہے  
 بیگم :- (آہستہ ہو کر) تم جانو تم کو غیر سے جو رسم دریاہ پر  
 مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ پر  
 غالب :- صادق ہوں اپنے قول کا غالب خدا گواہ  
 بچا ہوتا ہوں جھوٹ کی عادت نہیں مجھے  
 بیگم :- (گلوگیز آواز میں) چاہتے ہو حزب رویوں کو اسد  
 غالب :- سوا نہیں ، جنوں نہیں ، وحشت نہیں مجھے  
 بیگم :- تیرے وعدے پر ہے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا  
 کو خوشی سے مرنا جلتے مگر اعتبار ہوتا  
 غالب :- تم ہی کہو کہ گزارہ صمن پرستوں کا  
 بتوں کی ہواگامیسی ہی غور کیونکر ہو

بہتر کوئی سن کر زندگانی اور ہے

ہم نے اپنے جی میں ٹھانی اور ہے

غائب۔۔ دھمکتے ہوئے، نہ سونگر بُرا کئے کوئی نہ کھوگر بُرا کرے کوئی  
روک نہ غلط چلے کوئی بخشش دے گر خطا کرے کوئی

بیگم۔۔ پس چپ رہو ہمارے جی منہ میں زبان ہے

کیا تنگ ہم ستم زدماں کا جہان ہے

غائب۔۔ شکوے کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے

یہ بھی مت کہہ کہ جو کیسے تو بُرا ہوتا ہے

غائب۔۔ (طعن سے منسوب ہو کر)

رہینے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو

ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زبان کوئی نہ ہو

پڑئیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیسرا دار

اور اگر مر رہی تو زحمت خزاں کوئی نہ ہو

بے درد دیوار سا آگ گھر بنانا چاہیے

کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

بیگم۔۔ کھیل سہا تے کہیں چھوڑ نہ دے بھل نہ چلتے

غائب۔۔ (چلتے ہوئے)

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات

ٹھے اور دلِ آن کو جو نہ ٹھے عجب کو زبان اور

بیگم۔۔ (غائب کے جاننے کے بعد ایک دم چلتا کوئی دور ہوتی ہے)

اے ساکن کو چپے مل دار دیکھ  
تم کو کہیں جو غالبِ آشفۂ سرے

شرکتِ سخاوی



فرمن کی پیٹے تھے نے لیکن سمجھتے کہ ہاں  
رجم لائے گی ہماری غارتہ سستی ایک دن  
(غالب)



## بطرز غالب

رٹ باتھوں میں وہ رشت کے بے محفے ہیں  
 "مکن پہچے کر یہ کیا ہے تو چہ پئے نہ بنے"

سبے درد و دیوار سا اک گھر بن یا چاہیے  
 اور پھر اس میں مہاجر کو بسا چاہیے

سو رشت سے ہے پیشہ آبا "گھراگری"  
 کہہ "بیڈری" قدیم عزت نہیں مجھے

"سیاست بے ضیافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی"  
 ڈنر چال رہی جس میں سیاست اس کو کہتے ہیں

خدا کے واسطے مجھ کو منسرفی دے دو  
 "نرا مزاج لڑکپن سے 'بیڈرمانہ' ہے"

میں فسل ہو کہ ہو شیخ کی وہ ریش دراز  
جس میں پھنس جاتا ہے درڑ دہی جال اچھا ہے  
موجی دروازے میں کچھ نعرے جو لگ جاتے ہیں  
وہ سمجھتے ہیں کہ ممدوٹ کا سال اچھا ہے

مجید لاہوری



## اپنا اپنا قاتل

ایک غائب تھے کہ قاتل نے کیا قتل ان کو  
 اور کی قتل کے بعد اس نے جہا سے توبہ  
 ایک اکبر ہے کہ اُس پر یہی آفت بھی  
 لیکن اس عہد کے قاتل کی ریا سے توبہ  
 کی مرے قتل کی اخبار میں تردید اس نے  
 اور کرا دی مرے احباب سے تائید اس نے

راکبر لاہوری۔

## مدعا کیا ہے؟

اس پلنے سے مدعا کی ہے  
 میں نے تجھ کو سبلا کیا ہے  
 تجھ پر نازل ہوئی بلا کی ہے  
 دلِ نادان تجھے ہوا کی ہے

آخر اس درد کی دوا کی ہے

منہ میں ہر وقت پان رکھتا ہوں  
 جیب میں کیپسٹان رکھتا ہوں  
 ناک رکھتا ہوں کان رکھتا ہوں  
 میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں

کاشش پوچھو کہ مدعا کی ہے



## تماشا کیسے ہے

دیکھ، ہالٹ کا تماشا کیسے ہے  
جنوں تھے مہمان تو سنی تھیں محسوس  
جمہوریت تو تھی نہیں لیکن وہ چیز تھی  
دیکھے وہاں پہ غازی گفت اس قدر  
کردار کا ثبوت کسی نے اکر دیا  
تحریک، استرا کا وہ بازار گرم تھا  
انگریزی بونتا شاہراہ رکھیں وہیں کہ ہر  
نیڈی بھی اٹکے ڈیڑی بھی ڈیڑی بھی اٹکے  
دیکھیں مذہب و اندک خوش گویاں  
جہاں ایک شخص ہے اہل اقتدار  
باشت جبر کا آدمی بارشس مختصر  
کیا جو اٹکے سامنے بازم خود سری  
تھا اس قدر خلاف قوانین جس کی

یعنی اجماع کا ٹراسا کیسے ہے  
قومی اجماع تھی کہ صرا کیسے ہے  
جمہوریت کا بچہ جمہور کیسے ہے  
دل پہنچا کچھ ایسا کہ ٹراسا کیسے ہے  
اتنا کہ بس بطور نمونہ کیسے ہے  
بس بوسری بزار کا قتل کیسے ہے  
حکایت جتن کا جھٹپٹا کیسے ہے  
کیا تھا مسلم سادا کیسے ہے  
برہمن کا وہ تھا کہ گلوں میں ہے  
وہ چیز ہی گیا تھا کہ ہوا کیسے ہے  
کچھ ہی تماش کا تھا کہ ٹراسا کیسے ہے  
ایسا ڈایا اس کو جنت کیسے ہے  
گویا وہ تھا سفر کٹنگ کیسے ہے

ثابت ہوا غرض یہ کہ بازوئے صوبائی  
اس ملک کا ہے ایسا کہ گڑنگا کیسے ہے

## غالب ایک ریٹوران میں ایک اینگلو انڈین حسینہ کے ساتھ

(۱)

ہے گال چہ اس تلی کے سوا ایک نشان اور  
تم کچھ بھی کہو، ہم کو گذرتا ہے نگہں اور  
تم کہتی ہو، انگلش میں محبت کا کرو بات  
آتی نہیں اردو کے سوا مجھ کو زبان اور  
سعدی کی زبان ہی میں کچھ ارشاد کروں میں  
دُور ہے کہ گزرتے نہ کہیں سنجہ کو گراں اور  
بارب یہ نہ سمجھی ہے نہ سمجھے گی مری بات  
ملک اور ہے اس کو چوڑے ہے مجھ کو زبان اور

(۲)

کب سے ہم ادھر بیٹھا ہے اے بولتے ادھر آؤ  
یہن کے سوا بھی ہے کوئی چیز یہاں اور

لے کر دوسرے شے "جلدی سے اب" اور یہ سن کر  
 کہتے ہیں کہ غائب کا ہے اندازہ ہیں اور  
 عزم حکم ہو میڈم تو میں منگواؤں میں چاپ  
 کہہ دینا اگر چاہیے "دل" اور "زبان" اور  
 "دل" اور "زبان" کہ لا فراں اے بہرا  
 "دل" اور دے اس کو جوڑے مجھ کو زبان اور  
 مرنے والوں اس آواز پر ہل کتنی ہی بڑھ جائے  
 تو برائے سے لیکن یہ کہے سبائے کہ ہاں اور

(۳)

ٹانگے بھی مرے پاس ہے مٹم بھی مرے پاس  
 ہونٹ کے علاوہ سنبھ لے جاؤں کہاں اور

(۴)

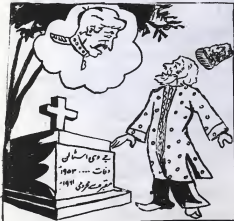
پاتے نہیں جب راہ تو ترک جاتے ہیں ٹانگے  
 ان دیکھ کے پسپا کیجئے ہوتی ہے "رواں" اور  
 کاموں کو جھگٹا ہوں تو آجبتے ہیں گریسے  
 تم ہو تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور

(۵)

ٹانگوں پر ہیں گندوں کے نشان پیٹ پر ہیں نیل  
 ہر روز دکھاتی ہے تو اک داغ نہیں اور

زہباک مٹی سیج سے گر ہاتھ چھڑا کر  
 سے آئیں گے بازار سے اک حد جہاں لوہ  
 اے جانِ تنہا تجھے اک حدں گامیں گھونر  
 ہنگام شب وصل جو کی آہ و فغاں اور

یاد محمدی علی خاں



ہوئے عمر کے ہم چڑھوا، ہوئے یکوں نہ فرق دیا  
 نہ کہیں جنازہ اُٹھتا، نہ کہیں مزار رہتا (وفات)

# کاکشیل

یہ نہ سستی بہاری قسمت کو وصل یار ہوتا  
 اگر اندھ مڑ پاتے، تو کچھ اور بات ہوتی  
 تو سے دور سے پرچئے ہم، تو یہ جان، جھوٹ جانا  
 کہ خوشی سے مرہی جلتے، تو کچھ اور بات ہوتی  
 تری ناز کی سے جانا کر بندھا تھا حد بودا  
 تو سے ناز سے بندھا تے، تو کچھ اور بات ہوتی  
 یہ کہاں کی دیکھتی ہے کہ بنے ہیں دوست ناہج  
 مولاہام بھی بناتے، تو کچھ اور بات ہوتی  
 غم اگرچہ جہاں گھسیل ہے، پہ کہاں پھیں کہ دل ہے  
 وہ جہول کی مان جلتے تو کچھ اور بات ہوتی  
 کسوں کس سے میں کر گیا ہے، شب بزم نمی جہا  
 سرشام اگر وہ آتے، تو کچھ اور بات ہوتی  
 ہوسے مہ کے ہم جڑ سوا، کئے کیوں مافوق دیا  
 وہ جنازہ خود اٹھاتے، تو کچھ اور بات ہوتی

یہ سائی تصوت ، یہ ترا بیجان ، انہر  
انہیں ہم سبہ بھی پاتے ، تو کچھ اور بات ہوتی

لے ۔ ڈی ۔ انہر



## نمک دان

کون سنتا ہی نہیں ان کی صد میرے بعد  
 ہائے کیا وقت اندیروں پر ا میرے بعد  
 وقت سے پہلے ہی اب اسکی سحر ہوتی ہے  
 ہونے فسرغ شبیر غم کی سزا میرے بعد  
 خبر کا کس نے شبیر وصل میں ڈالتا دوبار  
 بل گیا مجھ کو دغاؤں کا صلہ میرے بعد  
 کون ہاتا صبی بچوں کی قہاریں سے کھر  
 ہستیاؤں میں " چرمانہ میرے بعد  
 ان کی تفریح کا سامان طرب ستا میں ہی  
 ٹاکڑوگ ہیں جینے سے خفا میرے بعد  
 دیتے ہنر کون مجھ سا نہ ہوا جو پیدا  
 کون اٹھائے گا حقے نازبت میرے بعد

اپنی عمر دینی قسمت پہ ہنسی اُسنی ہے  
 دودھ بازار میں خالص بھی بگا میرے بعد  
 میرے ماتم میں نہیں، اپنی رقم کے غم میں  
 شہر کا بیاسیہ پوش ہوا میرے بعد  
 "خوش ہے دلی خاک میں احوال بتاں پر یمنی"  
 کس کا یہ جا کے وہاں گئے گا میرے بعد  
 رسم افلاس کی تہذیب تھی مجھ سے قائم  
 ہٹ گئی دھڑ سے جینے کی ادا میرے بعد

خاصی غلام محمد





## کاذب کا خط غالب کے نام

محترم اور معلوم چچا مرزا غائب  
اس میں تحریر متا کچھ حال سنن کا کمر  
دور حاضر میں یہاں شعر و سخن میں سہل  
قافیہ رات کا اب سا نہ ہے لایا جاتا  
ہوگ کچھ حوصلے سے بزار نظر آتے ہیں  
آپ کا نام مل آج بنام کاذب  
سن کے انوس نہ ہو گرتو بچا یہ سن  
شاعری ہو گئی اک طرح ذی شانل  
آج کل اس کا جب حال پایا ب تا  
ہر طرف نظم کے انہد نظر آتے ہیں

ان دنوں حزب ترقی پر ہے نظم آزار  
نہیں نے اس نظر کو بھی شر کا محول ہانا  
چند اس فکر میں تھے کہیں گے آزاد غول  
چندنا کام طول گو ہیں اسی صنف پر شاد  
نظم آزاد کو مشکل سے لکھتا سمبھا  
شکر اللہ کا اب تک نہ ہو اس پر حل

بول بالا ہے یہاں غزوہ طرات کا بھی  
بس اسی صنف سے گہراتے ہیں بنید مولیٰ  
نہ بڑا نہیں تو گستاخی کیے دیتا ہوں  
فکر ہی دینے پر کرنی مجھے ماضی نہ ہوا  
اور ترقی پر ہے اک صنف سن پر روٹی  
آج کل غزوہ طرات پر ہے اس شخ کا  
آپ کے شعر کی پر روٹی لکھے دیتا ہوں  
میر ہے وہ منتہ جو شکر نہ ماضی نہ ہوا

سوچتا ہوں کہ چچا آپ کو کیا کیا گھسوں  
مقتدر اور بھی نامے کو کیے دیتا ہوں  
غلی گیسوں کا بہت ریٹ بڑھا جاتا ہے  
ریڈیو پر بھی انہیں نشہ کیا جاتا ہے  
یوں شب درود اگر نشر نہ گانے ہرنگے  
مام کس طرح شبِ علم کے فاسلم ہرنگے

نرد ہندی میں کلام آپ کا چھپتا ہے  
ترجمہ آپ کے دیوان کا جلتا ہے بہت  
یومِ غائب بھی ہے ہر سال منایا جاتا  
ریڈیو پر ہے کلام آپ کا گایا جاتا  
آپ کو یاد کیا کرتے ہیں گنے دے  
آپ کی جان سے دور آچکے گنے دے  
بعد از مرگ محکم کا مقام اچھا ہے  
لوگ کہتے ہیں کہ غائب کا کلام اچھا ہے  
منطقی اور غریبی پر اپنی روستے  
بہنہ آپ جو اس دور میں پیدا ہوتے  
داسلم آپ کا اپنا ہی نتیجہ کا ذب

کا ذب مامی المعروف بہ صادق (مولا)



سے تمہیں سوتے ہیں اس کے پاؤں کا بوسہ ملو  
ایسی باتوں سے وہ کا فر ہنگام ہر شب گنا (غائب)

## آم — اور غالب

رکھ کے اک آم کفِ دست پر غالب نے کہہ  
 زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا لگے  
 غلے بارہ انگڑو کچھ منکر نہیں،  
 آم تقدیر سے مل جائیں تو پھر کیا کہیے  
 ہیں اپنا بھی عقیدہ ہے بغلِ غالب  
 سنتِ بدعت ہے جو مستعدِ آم نہیں  
 ہم سب زہِ فردوس

نشاۃِ جنت

آم سے ہرتی ہے افزائشِ حلی  
 آم کھاتے تھے بہت شوق سے یلا جمن !  
 آم کے فیض سے نام لگے ابھی زندہ ہیں !  
 صغیر، دھیرے تا بندہ ہیں !  
 اپنی روداد کو تاریخِ جو دہراتی ہے  
 آم کھاتا ہوں تو کھاد پل جاتی ہے

شام کے وقت میرے خواب میں آہ آتے ہیں  
یاد آیا ہے مجھے آہوں کا سزا آخر شب

نرسائش کی تمنا نہ مٹنے کی پروا

لامریدار سالک آہ کھلا آخر شب - رسی گھرا رہے مجھے آہ کی گھٹلی نہ سہی

غیب سے آتے ہیں آہوں کے مضامین گردش - گردشیں ہیں پچھلے اشار میں معنی نہ سہی

آہ کے باغ پہ غائب کی نظر سنی دکھ دن

دیکھتے دیکھتے اک بار غفر سے برے

شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

قبر غائب پہ جو اک دن میں سرِ شام گیا

ماسے احمل میں آہوں کی بسی تھی غرض

قبر سے کان لگائے تو یہ سوس ہوا - اک ظمناک سی آواز چل آتی ہے

مدح غائب نے کہا مجھ سے کر لے سوزِ حال - مجھ کو معلوم ہے کیا حال ہا میرے

آہ کھانے سے جو اس کو کبھی فرصت نہ ملی - حسنِ غزنے کی کشاکش سے چٹا بجے بد

شاہ جدید یعنی

~ ~ ~ ~ ~

## تربوز

۔۔۔ حامی داریت اور صاحب کے بیچے کئے تھے تربوز کی خرید میں فی البدیہہ نگر کی بڑی تھیٹھی  
 (مرزا غائب کی چکن ڈل کے انداز میں)

حامی صاحب نے ہر جیسا ہے بڑا س تربوز

زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کئے

دل کا اصرار مگر یہ ہے کہ کچھ تو کھینے

کچھ تو تقلید میں غائب کی خدارا کئے

گنبد تاج محل سے اسے دیکھئے تشبیر

احراماً - ۵ اگر گنبد خضرا کئے

بے تکلف - سر شریفہ جنوں کھینے

بے تامل - شکم ناتسہ ملانی کئے

یا معیت سے اسے مانئے سنگ اسو

یا سراقد کسی حامی پر عامرہ کئے

خواہ کھینے مر حیدر کی زمبیل اسے

خواہ سے خاندانیت م کا ملکا کئے

کھینچے اس واسطے عقل و سرگنج قادروں  
کس لیے جنت شہاد کا میوہ کیجئے

کیوں - قصور - عدوت گہر کیا کیجئے

کوۃ ارض کا کیوں آپ بیولا کیجئے

لطفِ الحاج کو فرد کس سمجئے ہرن

اور تربیت کو فرد کس کا تحفہ کیجئے

ہرن



آگنی دھام شفیق جس قدر چاہیے بکھائیے

(غالب)

وفا عطا ہے اپنی عالمِ تعزیر کا

## بوریا نہ ہوا

کون غریب کی شکر کی کھا،      میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا  
 سب پر کمال تو اسے میں پہنچا،      اک قاتل ہوا بھلا نہ ہوا  
 کیا یہ غریب کی حسد ان ستمی،      بیٹھی میں مرا بھلا نہ ہوا  
 دس گارشت میں کیا پیا ہی کو،      آج ہی گھر میں بسا نہ ہوا  
 بیوی بچوں کی خوب خدمت کی،      حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا  
 رات دن میں سوائے ایک آپ کے،      تجھے کچھ بھی تو حق ادا نہ ہوا  
 ڈر گیا وہ بھی اب تو بولنگ سے  
 آج غالب غزل سرا نہ ہوا

آزاد جہاں پال

## مذرفالاب

عشق پہاڑ جوڑانا توڑائے نہ بنے  
 کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے  
 کمن طہری کمن دھری کمن ٹوڑی کا خیال  
 بات جیجی انہیں کھڑکی میں ہی گئے نہ بنے  
 مہر کسے ڈوبی یہ ایمان پسندی میری  
 پاس آئیں تو انہیں ہمتہ لگائے نہ بنے  
 کہہ کے کن وہ زکس ہے ثریا کو نگار  
 پردہ گرا ہے کچھ اتنا کہ بتائے نہ بنے  
 عشق وہ کج محل ، لال تلہ ہے پیاسے  
 جو مٹائے نہ مٹے اور بنائے نہ بنے  
 زہیر قریشی



## مذہر غالب

پا بنے سے چلے سوچ پا بیٹے  
دھوکے نہ آئیں نہ دیکھا پا بیٹے  
سہر سنبھل کر تم کو کتنا چاہیے

پا بیٹے اچھوں کو جنت پا بیٹے  
یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیے

جس کی آنکھیں زند ہوں چہرہ سپید  
جس کی پتلی پڑ گئی تاب حزیں  
جس کی مٹی منفس نے کی پسید

مغصہ مرنے پر ہر جس کی امید  
نہ امید ہی اس کی دیکھا چاہیے

جیب میں جس دم کو کم ہو نقد و نقد  
میکدے کی سمت ہو قصد سفر  
اور ہو یاروں کے مل جانے کا ٹھہر

صحبتِ زنداں سے واجب ہے عند  
جائے سے اپنے کو کھینچا چاہیے

کیا مجھ کو خبر سے بہکا صفا دل  
کس کے چکڑ میں تن پھرتا تھا دل  
مقل پر یوں کیوں ہنسا کرتا تھا دل

ہا جنے کو تیرے کیا سہا تھا دل  
ہائے اس سے بھی گھٹنا چاہیے

خاش مت کر جیب بے ایام گل  
ترک مت کر شیب بے ایام گل  
ہے یہ اذن غیب بے ایام گل

چاک مت کر جیب بے ایام گل  
کچھ اُدھر کا بھی اشارہ چاہیے

ضبط کا رتہ عمل فسرنا ننگی  
کب چھپائے سے چھپی دیرا ننگی  
غصے سے ممکن نہیں پرمانگی

دستی کا پردہ ہے بے گانگی  
منہ چھپا، ہم سے بھڑا چاہیے

عاشقی نے میری بیا غییر کو  
لے ڈھرایا نہیں نے گریا غییر کو  
بے ضرورت اتنا ڈھویا غییر کو

دشمنی نے میری کھویا غییر کو  
کس قدر دشمن ہے دیکھا چاہیے

ہائے سے کیا کبھی پھٹی ہے سی

یا کھانے سے کبھی گنتی ہے کسی  
جب بھی دیکھا ہوتا ہی ملتی ہے کسی

اپنی رسوائی میں کیا پہنتی ہے کسی  
یار ہی ہنگامہ کرا عہد ہیئے

اس طرح کی حرکتوں کے واسطے  
ہیں فرشتے لعنتوں کے واسطے  
اور پیراؤں سے جنوں کے واسطے

غافل ان سرطلتوں کے واسطے  
چاہنے والا بھی اچھا عہد ہیئے

تاؤ مت مد اپنی مونچھوں کو آستہ  
جاکے جھڑوؤں کے کرپوں کو آستہ  
رگوں کے بھاگ سر پہ پریں کو آستہ

چاہتے ہیں ٹھہریں کو آستہ  
آپ کی صورت تو دیکھا عہد ہیئے

عہد واپ فراد

## غزل

بات ہے بات پر سزا کیا ہے      تم کو لے ٹیڑھ ہوا کیا ہے  
 قیسری بار ہو گئے ہم فیصل      میا الہی یہ ماجرا کیا ہے  
 آٹھریں میں ہیں اور نسیمِ صوم      مہا پر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے  
 ہاں خبر امتحان کی سنیں کر      دل نماں تجھے ہوا کیا ہے  
 امتحان سب تو لے گا جتنی میں  
 مہرِ دنیا میں لے خدا کی دینے

عابد نظامی

## مرزا غالب کے معذرت کے ساتھ

کچھ رقم مل جائے بہرے پرستی ایک دن  
 ورنہ ہم چینیں گے دکھ کر معذرتی ایک دن  
 شہر کے باہر اکیلے مل گئے جب تم بے  
 یں آمدن کا تنہا ساری سستی ایک دن  
 شرع و قانون سے فوٹی کی سر بندش کریں  
 لاکھ سے بیس گے انہوں نے پرستی ایک دن  
 اقتصادیات کے ماہر جو فرماتے تھے کل !  
 خواب میں ہو گی نگہم جینی کسستی ایک دن  
 بیٹ کا دوزخ قسبہ ہر روز ایندھن ناگتہ  
 کیا کریں گے آپ میری سر پرستی ایک دن  
 وہ قرص کی کوس سے ہرچ ڈھیلے کر دیئے  
 ہم سے کر بیٹھے تھے داعی ویش رستی ایک دن  
 مرا فضل خاں ،

## اندرونِ خشنا

روشنی آگیا گا رہی تھی ایک بڑے بیڈر کے گھر  
 نقشِ فریادی ہے کس کی شوخیِ تسخیر کا  
 ریشمی صوفوں کی زینت تھے غزل، آئینہ آئینہ  
 کاغذی تھا پیرہن ہر ہیکل تصویر کا  
 کہہ رہے تھے کرسیوں کی فکر میں امیدوار  
 صبح کو شام کا قاف ہے جوئے شیر کا  
 ہلاتی تھی وقت گزرنے کی جبین پر شکن  
 دعا سنتا ہے اپنے عالمِ تعمیر کا  
 آہنی پیکر ہمارا اُٹھ رہا حزانِ جبل  
 سنے آتش دیدہ ہے سلتہ مری زنجیر کا  
 بڑوں کے معنی سپرے کی زردی دیکھ کر  
 رنگ اُڑتا جا رہا تھا چہرہ شمشیر کا  
 ناش ہیں اسرارِ تبصری پر رموزِ محبت  
 پیش آجاتا ہے سب کچھ ہوا تعمیر کا

## سخن غالب شکن

مہ بھی یہ گرنسیں آتی  
 جلنے کا سہا گرنسیں آتی  
 آتو سکتی تھی پرنسیں آتی  
 کتنی امید برنسیں آتی

کتنی صحت نگرنسیں آتی

جب سے کمان ہے شتی کی گل  
 اپنی صحت ہونے ہے جنوں کی  
 تم کو کیسے صبر خبر ہوتی  
 ہم دہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی

خود ہماری خبر نہیں آتی

اب فرنگی نہ اب درجن ہے  
 نہ پولس سے کچھ اپنی ان ہے  
 نہ داخلی ہی کتنی ناہی ہے  
 موت کا ایک دن صبح ہے

نچنے کیوں رات بھر نہیں آتی

مگر آنکھوں کو کام میں نہ آتا  
 پھر تو اندھا کبھی نہ کھاتا  
 تاک اپنی جٹ ہے کھاتا  
 خارج دل گر نظر نہیں آتا

تو بھی اے چارہ گر نہیں آتی  
 دنگ اپنی یوں بھی ہے گزری  
 بدحالی سی چپٹی رہتی تھی  
 سر پہ جتنا ستارہ پاؤں میں ٹپتی  
 اگلے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی

اب کسی بات پر نہیں آتی  
 جو کسی بے دغا پہ مرتے ہیں  
 روتے دھرتے ہیں آہ بھرتے ہیں  
 وہ غمگینی سے میری ٹدھتے ہیں  
 کیوں نہ چہیزوں کو یاد کرتے ہیں  
 مری آواز گر نہیں آتی

ج - خ - شمس



## گدھا کیسا؟

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے      تجھ میں دھک دھک کی یہ صدا کیا  
 ”اسپر“ جس پہ کارگر نہ ہوا      نہ آخر اس درد کی دوا کیا ہے  
 زوال و جی سے ہم نے یہ جانا      بھیجیں کیا چیز ہے گدھا کیا ہے  
 رازِ یکسوی نے فاش کیا      ”اہر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے“  
 انگ کیا شے ہے ساٹا دھتے      گیس ہے او مار کیا ہے  
 ہے یہ سائنس کے لیے عقدہ      غزوہ دشوہ و ادا کیا ہے  
 ایک سبکٹ میں بھی پاس لگے      فیل ہونے کا پھر مزا کیا ہے  
 جب سے کالج میں آئے بھل گئے      ہانڈی چلے جا ہے کیا تو کیا ہے  
 ہم تو گیسوں سے آشنا تھے مگر      یا الہی یہ باسبر کیا ہے

مگر پڑوسن کا مرغ ہے لنگڑا  
 مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے

# غلب اور انیس

میر صاحب نے یہ فردوس میں غائب کہا  
صغیرِ ازل کے اویب اور بہت سے شورا  
معزت ہیں کہ تمہیں حق سے ملی فکر رسا  
کھنڈ آئے مگر مرثیہ تم نے نہ پڑھا

اس قدر عظمت فکر میں ستیا جی کی  
کیوں نہ پھر حضرت شعبیرؑ کی مداحی کی

ہوے غائب کہ مرا رنگ سنن ہے تو نفیس  
میں سلیمان غزل، منکر رسا ہے بقیس  
ہے تختِ مرا فردوس نشینوں کا جلیس  
غافلہ روئے ادب ہیں مرے اختصارِ بلیس

لیکن اندازِ سنن آپ کا کیسے پاؤں  
شہسپ حضرت جبریلؑ کہاں سے لاؤں

آپ کو یہ ہے سہولت کے ہیں مروجِ امام  
جن کی توصیف میں آیا اب کوثر یہ پیام  
جن کو تسنیم کی موجوں نے کیا اُٹھ کے سلام



شرقِ داعیِ شہید کا یہ ہے اہم  
عرشِ اعظم پر ملکِ صلّیٰ علیٰ کتبہ  
آپ کو زاکرِ ستارہ شہدا کہتے ہیں

۔ ملکِ عثمانِ تکلم ہے فصاحتِ کس کی  
۔ ناطقے بند ہیں سن سن کے بلاغتِ کس کی  
۔ رنگ اُڑتے ہیں وہ رنگین ہے جہالتِ کس کی  
۔ شہد جس کا ہے وہ دریا ہے طبیعتِ کس کی  
آپ کا رنگ جدا اور مراد رنگ جدا  
کس سے ہو سکتی ہے داعیِ مروجِ خدا

میرا نہیں اس پر یہ بوسے کہ ضیے جہانی نہیں  
منقبتِ آپ نے مولیٰ کی نکھیں ہیں وہ حسین  
جن کو تسلیم کریں روح و قلم دست و جبین  
جن سے ہو سکتی ہے آرائشِ فردوسِ بریں  
دل ہی جاتا ہے جو ہوتا ہے کسی کا مقوم  
سات وائشِ خدا و نفعِ جہالتِ مہم

توسیع کو جب تم نے کیا سے مہینہ  
مرثیہ میں نکل آئے ہیں، سننِ دل آویز  
تم نے اللہ سے کی تھی یہ دعا دردِ انگیز  
غمِ شہید میں سینہ پر یہاں تک لہریں

۔ کہ رہیں خونِ جگر سے مری آنکھیں رنگیں  
جو عاقل کو کسی کو کہی ملتا ہے کہیں



گفتگو جاری تھی اور غیب سے آئی یہ صدا  
 کر دیا حق غزل حضرت غالب نے اور  
 میر صاحب کے لیے مرثیہ انعام خدا  
 بنا فردوس میں ہر پھول کی رنگت ہے بُدا

”جس طرح کا بھی کسی میں ہر کمال اچھا ہے  
 کام اچھا ہے وہ جس کا کہ کمال اچھا ہے

سید محمد جعفری



میری قیمت میں علم گزرتا تھا دل بھی یارب اکٹھے دیے جوتے غائب



# برنگ غالب

روز جا کر ان کے گھر زنجیر در کھڑکائے ہے  
 کیوں بھلا بیٹھے بھائے سر ترا کھائے ہے  
 نت نئے نظم دستم وہ روز مجھ پر لٹائے ہے  
 میں تو سبھا تا کر وہ اڈا میاں کی گائے ہے  
 زندگی کی راہ میں کیسے چلے گا سہ ماہ  
 لوگ کہتے ہیں کہ وہ نازک اما نگر لٹائے ہے  
 رزق رزق جو رہا ہے ان کا چہرہ بے نقاب  
 رنگ کھٹا جائے ہے غارہ جو اڈتا جائے ہے  
 غائب کچھ ہو چلا ہے مہیری آہوں کا اثر  
 لوگ کہتے ہیں وہ کافر نیستہ میں بٹھائے ہے  
 خواب میں اک روز اس نے مجھے کر دیکھا تا غنیم  
 کج بھی وہ سوتے سوتے نیند میں ڈر جائے ہے  
 عظیم عباسی





## غائب بادشاہ شوکیہنی میں سیزمین

کبھی تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں      کبھی تیری چہل کر ہم دیکھتے ہیں  
 ترے سرو قاصد چو فٹ کم از کم      قیامت کے نکلنے کو کم دیکھتے ہیں  
 جہاں کیسے میں گئے وہ چہل کی قیمت      جو تیری طوت دم دم دیکھتے ہیں  
 ہیں پیٹھے تو اگر ہم بتا دیں      تجھے کس قنا سے ہم دیکھتے ہیں  
 جنہوں نے ذرا سہہ کیا تھا خدا کو      تجھے ہو کے وہ سر پر غم دیکھتے ہیں  
 یہ مندی رچا پاؤں چہل میں رکھنے      ذرا کج سے چہرے کے ہم دیکھتے ہیں  
 بنا کر چاروں کا ہم جیس غائب  
 تماشے اہل کرم دیکھتے ہیں

راجہ مسدی علیاں :

~~~~~




سہیلی بوجھ پھیلی

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں !

کوئی نذر سناؤ گئے غائب	رات کی رات آؤ گئے غائب
ایسٹ آباد کی فضاؤں میں	پھر وہی گیت کھاؤ گئے غائب
کس براہیم وقت کے خون سے	عید قرباں مناؤ گئے غائب
منہ اقتدار کی حنا طر	جانے کیا لگی کھلاؤ گئے غائب
خونے بدرا بہہ لڑ بیدار	حال پر سکراؤ گئے غائب
قوم تو مڑ چکی ہے مدت سے	اب کسے ڈمب پہ لاؤ گئے غائب
اس تماشہ گمہ سیاست میں	ملک کو بیچ کھاؤ گئے غائب
ہار کر نقد غیرت و بشار	کرسیوں کو سہاؤ گئے غائب
ہم نے تو آزمایا ہے تمہیں	تم کسے آزمائو گئے غائب
دل میں زلفِ بجاں کا سوا ہے	کبہ کس منہ سے جاؤ گئے غائب
شرمِ تم کو مگر نہیں آتی	

انوارِ مصبری



غالب کا بستر

میں نے اپنے لئے غالب کا بستر جیسا موضوع منتخب کیا ہے جو بظاہر پیش پا افتادہ ہے۔ لیکن مذہبیت تغزل انگیز ہے جس پر آج تک کسی غائب شناس کی شاید نظر ہی نہیں گئی یا شاید اپنی محدود و بساط کے حدود میں غمر و سرور کرنے کے بعد بھی یہ معلوم نہ کر سکے ہوں کہ غائب کے بستر کا حدود و ربع یا طول و عرض کی قیاد بڑی چون۔ بن کی بہت سرکھپا یا غالب کی مشہور جو گرانیالہ پر ٹھیں۔ ان میں غالب کے پتنگ کا تذکرہ ضرور ملتا ہے۔ مگر اتنا علم نہ ہو سکا کہ ہر دم کس قسم کی رضائی اوڑھتے تھے اپنی نازک مزاجی اور نفاست طبع کے پیش نظر غزل و کغالب کی ریشم و اٹلس کی یاد دہانی اور وہ ٹکی پٹکی رضائیاں جنہیں کندھوں پر ڈال کر سیر کے شوقین بیابان و بیابان کرتے پھرتے تھے کہ آج دن میں اتنی رضائیاں کی سردی پڑی ہے پھر یہ مسئلہ بھی بخیر و متوازن فیض ہے کہ آیا غربت اور کس پر سی کے دور میں غالب نے کبھی کندھ کے مات بھی جوئے تکبیر ایک استعمال کرتے تھے یا دو تین ماہر کیا کبھی تکبیر سر کے علاوہ دانتیں بائیں پسلیوں میں بھی رکھنے کے شوقین تھے پھر رضائی اور تکتے میں مدنی عام کپاس کی بوتلی بھی یا سنبل ٹیکان کی ماسی طرح مروج سفید کپیس استعمال کرتے تھے یا رنگ دار چاند نہ بچھاتے تھے یہ وہ اہم سوالات ہیں جن پر یا تو غالب کے خاندان کا کوئی ایسا فرد روشنی ڈالت جس کے پاس روایت سینہ جہیز چھلی آئی۔ یا کوئی قریب و اقرب و اقربان کے لئے غائب کا قہری رشتہ دار بن کر حکومت گھر چلا کر یہ ٹکی نہیں تھی تو غائب مروج کا ستودہ کے قصائد پر اور غزل کی طرح نہ سہی علامہ اقبال کے بھی ملازم علی بخش ایسا ہی غنی فہم خدمت گذار میر آجاتا جو اندرونِ خانہ روزمرہ کے حالات



تیرا نقشِ حالِ من در آینهٔ تو
 بر آینهٔ تو در آینهٔ من آید



پیشِ تو ای مردِ دل‌خواه
 ای که هستی در آینهٔ من

نورمحمد

چرا کہ حضرت سرخ لائٹ قال جانا یا کم انکم انکی شب بصری کی رات نہیں ہی چٹھارے سے لے کر سنا جاتا یا کوئی مزاحمتیں کے ملازم رمضان کی طرح ہونا میں کی اکثر بات حیات شعروں میں ہی عوفی حق مزاحمتیں اگر کھیں سے تنگ آکر گئے۔ رمضان، گناہ می آئندہ تو رمضان فوراً دوسرا مہرہ لگاتا۔ انکس پیش گناہ می آئندہ اگر ہم خبر دانی ہوتی تو کہتے۔ ایک انگلے سے بیاد و جینہ پر ہم ما یہ دوسری بات ہے کہ جواب میں کہیں سے آواز آتی: لیکن بہ شرط آنکہ نہ سوز و گم و نہ آج تقدیر ان غائب اور اب نواز علیہ شش و پنج میں مبتلا نہ ہوتے۔ بخدا آج تو مولانا محمد حسین آزاد و حضرت حالی پر بھی رون کر پیش آتا ہے کہ اگر یہ بلند مرتبت تذکرہ نویس گئے یا حضور غائب کے تاریخی بستر پر بھی طبع آنا کی کوجاتے جبکہ انہیں چشم دید گاہوں کی حیثیت سے بخفی علم تھا کہ ان کی شاعری اور بستر کا چرل و امن کا ساتھ ہی تو غائب کی زندگی کا یہ پہلو بھی اجاگر ہو جاتا۔ لیکن محمد حسین آزاد کو نام تو میں نے یوں ہی پیش میں ہے قابو ہو کر لے لیا اور نہ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ آزاد کو ذوق کی چشموں کی وجہ سے تمام حق شاعر دی غائب کو بے بستر یعنی کھٹے پٹنگ پر سونے کے عادی ہونے پر ختم کن تھا۔ چاہے آپ حیات میں کتنی ہی تلی آجائے۔ لیکن حیات بوقت ہے کہ غائب کے اس شاعر کو رشید خاں نے کچھ نہ لکھا، جبکہ ممکن ہے کہ جناب سنان غائب کی غیر حاضری میں نظر بجا کر کہیں اس بستر پر استراحت بھی فرما چکے ہوں۔

شاعری ہی نہیں بلکہ غائب کی دوسری ادبی کارستانیوں کا دافعہ بھی بستر کا مروجہ منت ہے۔ مہینہ نے لے دے کہ غائب کو چچا مشکوک تہم کا خطاب دے کر خاموشی اختیار کر لی۔ غائب تو تنہا ٹھہرتا رہا جبکہ زمانہ قیامت کی چال چل کر اب میں کتنی تاب ہے۔ جسم دے چکا ہے۔ حالی نے دو بار غائب لکھی مگر استاد کا بستر گول کر گئے۔ ان سے غائب کے بستر والا بانگ پہلوں جانا اور دو س کا بہت عظیم المیہ ہے جس کی تلافی ناممکن ہے۔ حالی کو صرف ایک ہی واقعہ یاد ہے کہ ایک دوسرا بستر پر دو روزہ تھے میر محمدی خروج آکر ان کے پاؤں دبا دے لے۔ برائے گناہ بیدار نہ ہوا۔ وہاں دبا کر گناہ کرنے کو نہ میر محمدی صاحب نے گناہ پاؤں دبانے کی اجرت دے دیتے کا تہمت آ کر



کتابخانه ملی و موزه و مرکز اسناد مجلس شورای اسلامی

پردہ انہی بندھے، جب تیر صاحب پاؤں دبا چکے تو اجبت کا صاحب کیا مزا صاحب نے کہا آپ نے
میرے پاؤں دبا دیے میں نے آپ کے دام دبا دیے صاحب بولہر ہو گیا اس نادر موقع پر بھی حال ہے
آرام سے غائب کے بستر پر روشنی ڈال سکتے تھے جب وہ اس حد تک الکشان کر دیتے ہیں کہ
موزارات کو ہنگ پر بیٹ کر اشعار ملکا کرتے تھے اور فی شعر از بند کو ایک لگانے دیتے جاتے
تھے، صبح گانٹھوں سے اشعار کی تعداد معلوم ہوتا تو کتنی۔

ازار بند کی گانٹھوں تک پہنچ جانا باہمی اعضاء اور ذاتی معلومات کی آخری منزل
ہے تو پھر اتنی زحمت گزار کر کہنے میں کیا مضائقہ تھا کہ حضرت غائب غزل بستر پر اذیت سے نہ پیا
بید سے بیٹ کر لکھنے کے قائل تھے۔ شاید ان تذکرہ نویسوں کی آغوش آب حیات میں نقل شدہ
یہ لطیف ہو گا کہ جب ایک استاد کے لئے لکھا گیا کہ وہ صرف گادگیر پر بیٹ کر شعر کہتے ہیں تو کہنے
والے نے یہی کسی کریم تو عمر کا نہیں شعر چننا ہوا۔ ہر حال اگر کہیں تو کم از کم یہ بتا دیتے کہ غائب
قصیدہ فرشیہ یا سہرا لکھنے وقت تکیہ لکھنؤ پر رکھتے تھے یا کوڑیوں بدل بدل کر خطائی کیفیت
پیدا کر کے لکھتا تھا۔ پھر شاگردوں کے کلام میں اصلاح دیتے وقت ان کی طبیعت کس انداز
میں موزوں ہوتی تھی، یہی نہیں کیا دنیا و مافیہ سے بے خبر ہو کر غائب پر بھی ایسی کیفیت بھی
حاری ہوئی کہ شعر لکھتے وقت بستر سے بے اختیار فرش پر گرتے۔ بزم گریبوں میں بستر پر چھروانی
لگانے کے شوقین تھے یا چھروں سے بھونکے ان کے ان سے دست بجز رکھتے تھے یا چاروں
شانے چٹ ہو کر ان کی بھینٹا ہٹ سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔ چھروانی کا پٹا کس حد تک
تھا، یہ وہ ڈاکر کی مثل تھی جو انہیں تحفہ میں سی تھی یا ٹکڑے سے خور لاتے تھے، جہاں کی یاد
کو بستر بنا کر بیٹے میں ہمیشہ محبت رکھتے تھے، چونکہ سالی سے غائب کے بستر پر ادبہ و دست یا
کسی مصلحت کے پیش نظر جس کو بوجہ شاگرد خاص ہونے کے صرف ہی جان سکتے ہیں تو قلم فیضان
میں اس قدر کوتاہ فہمی ہوئی ہے کہ اس مصلحتی فوج گداشت سے اب ہمارے پاس اس کے
سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے کہ غائب کے کلام بلاغت نظام سے اشعار چنی کر ان کے بستر کا



تانا بانا بنایا جائیکے شاید اس طرح اس بستر کی نرمی یا گرمی ہمارے حاضرین بھی محسوس کر سکیں۔

دیوان غائب سے یہ حقیقت تو چند نروشن کی طرح عیاں ہے کہ غائب کو ایک عاشقِ صادق کی طرح اپنے محبوب سے دلانہ عشق ہے۔ معشوقِ روانی معشوق کی طرح کوشش کرتا ہے۔ لیکن غائب بھی کئی گویاں نہ کیسے تھے۔ نامِ عمر پوری وطنی سے تندہی سے محبوب کو موم کرنے کے لئے مختلف اقسام کے پاپے بیٹے رہے۔ جن میں سے ایک صدی نسخہ اس کے کوچہ کا عرواق تھا جہاں خوش قسمتی سے کافی تک دھوکے بعد ایک سنہری موقع پر حضرت غائب کی حادثات اپنے محبوب سے بوجھتی ہے۔ حضرت غائب اس موقع سے فائدہ اٹھا کر محبوب کے مکان کے باہر اپنا بستر بچھنے کی ہر اور راست محبوب کے ہی اجازت طلب کرتے ہیں (کیونکہ اس وقت پاپاں شاید حشر جیسے پاکسی دوسرے ناخواندہ عاشق کو لگی سے ہانک لے کے لے گیا ہوگا) جسے محبوب بجز خوشی قبول کر لیتا ہے۔ لیکن اچھی غائب چٹکیاں بجا کر بستر بچھا کر منسی خوشی بیٹھنے کی ہدایاں کرنے لگتے ہیں کہ محبوب اپنا اصل داؤ کھیلنا ہے اور فوراً اجازت واپس لے لیتا ہے جس کا اُن پر فردی ردِ عمل ہوتا۔ رنگِ زہد پر لگا، قدم ٹھکڑا کرنے لگے۔ کیونکہ کہاروں کے کندھوں پر پاکی میں بیٹھنے والے غائب آخر اپنی آٹا کو مٹی میں ملا کر بستر سمر پر رکھے کوچہ محبوب سے جدا پنچے تھے۔ جہاں ان کا یہ حشرت، اک حشر ہوا۔ لیکن اس کوچہ سے بے آبرو ہو کر نکلنے وقت بھی فم غلط کرنے کے لئے آپ ہی آپ بڑبڑلاتے رہے۔

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسے پھر گیا

جتنے سے میں مرا بیٹا ہوا بستر کھلا

یہ وثوق سے تو نہیں ہا ہا سنا۔ البتہ قیاس یہی ہے کہ بستر معمولی درجے کا ہے اور زیادہ سے زیادہ ایک کھیس ایک رضائی اور کچے پر مشتمل ہے۔ جسے غائب نے محبوب کے حکم پر جلد از جلد محمولہ یا کم از کم محبوب کے دروازے پر بچھانے والا بستر نہایت مختصر سفری قسم کا بوجھ جیسا لوگوں نے شاید حشرتِ موبائی کو بغل میں دبائے ہوئے صرزدور دیکھا ہوگا۔ لیکن آنکھ چپکتے ہی آؤ ڈرہا پس



کی اور حسبِ روایت دوسے شکیں کا انکباب کرتے ہوئے بارش کا ہمارے کمرے نہ آنے کا پیغام
بھیجا۔ دوسرا انہوں نے آنکھیں بند کیں اور فرمایا کہ

دلِ کرم کو غنبدِ بارش تھا عینِ گہرِ خرام گریہ سے یاں پنہا ہائش کفِ میلاب تھا
جب اس شعر کو پڑھ کر بھی دل کی بھڑاس نہ لگی اور تسکین نہ ہوئی تو محبوب سے ہزار
اور زندگی سے تنگ آمدہ غائب سسر بھوڑنے کے لئے دیوار کی تلاش میں نکلے۔ لیکن
دارِ تنگی کے عالم میں چوک یہ ہو گئی کہ کوچہِ یار کی بجائے صحرایِ طرت نکل گئے اور وہاں پہنچ کر چاروں
طرف دیکھا تو میدانِ صاف تھا پریشان ہو کر کہنے لگے صحرا میں اسے خدا کوئی دیوار بھی نہیں آئی
شاد میں ڈھونڈتا ہوتا ہر بھی ادھر آنکلا۔ جب نظریں پیغامِ رساں سے دوچار ہوئیں تو بڑی
بے بسی کے عالم میں محبوب کا حال انحصار کی مظلوم ہٹا کر محبوب پیغام دینے کے بعد گلاب
کے تیکے پر استراحت میں مصروف ہو گیا تھا۔ یہ سن کر غائب کے سینے میں ایک تیرسا لگا جو
افشاں ہو کر پارتل لگی اور دشت کو دیکھ کر گھریا دیا گیا۔ سوچا لاڈ اپنے گھر کی دیوار سے ہی سر
بھوڑیں کہ

یاں سر پڑ خود بے خوابی سے تھا دیوارِ بھر

وہاں وہ فرقِ نازِ محبوب ہائش کم خواب تھا

غائب! اس کے بعد قاصد کے بھٹلنے بھٹانے سے خود کشی کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ پہلے بیڑم
کے چکر کاٹتے رہے پھر زمین پر آتی پاتی بار کر بیٹھ گئے۔ محبوب کو بھٹلانے کے لئے لاکھ جتن کئے
مگر وہ بلا بریا و آقا رہا۔ پھر سوچا لاڈ سو جائیں شاید وہ خواب میں آجائے۔ لیکن اضطراب
نے سونے نہ دیا کہ

وہ آئے خواب میں تسکینِ اضطراب توئے

وے غمے چشمِ دلِ محالِ خواب توے

خود خاکسرخِ نیش تھے اور قصورِ محبوب کے بستر کی طرف منتقل ہو چکا تھا جو کم خواب کے تیکے
پر سر رکھے مٹی نیند سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس قصور سے غائب کی آنکھوں میں خون اُتر آیا
نیند حرام ہو گئی۔ بد قسمتی سے اس زمانے میں خواب آگد گوریاں یا مافیا کے انگلشن بھی دستیاب

ہونے پر جو نئی بستر بیٹ کر لے نکل مریم واپس لوٹنے لگے تو حیدر محبوب نے ڈھارس بندھائی کہ مکان کی ڈیڑھ سی دوسرے بھاٹیوں سے مشترک ہے جن سے اجازت یعنی ضروری گئی مزید ہیں سر دی جو بن پر ہے جس میں دروازے پر بیٹھنے سے غائب خستہ ہو گا ڈیل نوید ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اس نے فی الحال تشریف لے جائیں۔ محبوب نے نفس نفیس ان کے گھر پہنچ جائے گا۔ اس ان ہونی پیش کش پر غائب کی باجیس کھیں گئیں اور وہ شاداں و فرحان گھر لوٹ آئے اور لگے انتظار کرنے ہمسایوں نے پوچھا پچھا یہ آپ یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہیں۔ کہا بھائی محبوب نے وعدہ کیا تھا وہ تو خیر کیا آئے گا البتہ قاصد کا انتظار ہے کہ وہ کم از کم سہی پیغام لے آئے کہ آج آسکے نہیں ہم آج ہم کو کام ہے (حسرت کا مصرعہ ہے) اس لئے ہم کبھی قضا کو کبھی ناسربر کو دیکھتے ہیں۔ آخر تک ملنے لگے۔

وعدہ آنے کا وہاں کچھ یہ کیا انداز ہے تم نے کیوں سوچی ہے میرے گھر کی بہانے لیکن آخر محبوب بات کا پکے نکلا اور شام کو جب وضع دار محبوب نے اپنا وعدہ پورا کیا یعنی اٹھ گیا تو غائب کو مشکل سے نفیس آیا کہ آیا واقعی وہ عودا گیا ہے اور کیا واقعی یہ میرا گھر ہے یا میں محبوب کے دروازے پر پڑا ہوں۔

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں اور جب محبوب چلنے چہڑی باتیں بنا کر اور ٹھیکہ دکھا کر جلتا بنا تو رات بستر پر دروازہ کو محبوب کی یاد میں پہلے بوسیدہ چھت کی کڑیاں اور پھر انتظار کی گھڑیاں گئیں بیکرڈوں کو دیکھتے پتے رہے۔ جو جمل اٹھتا ہے یہ پہلو تو وہ ہلو بدلتے ہیں۔

جس پر غائب نے فی البدیہہ کبھی نہ سمجھے اور کبھی اونچی آواز میں تو دنا شروع کر دیا جب صبر کا دامن بالکل ہاتھ سے چھوٹ گیا تو وہ دھڑکیں مار مار کر رونے لگے غائب کے رونے کا انداز بیان بھی مجھ تھا۔ معلوم ہوتا ہے وہ بڑی بے جگری اور خلوص سے رویا کرتے تھے۔ ان کے اس طرح زار زار رونے کا یہ فیضان خزاں کہ ٹیکہ کی روئی ٹمک بھیگ گئی اسی دوران محبوب نے جتنی پرتل کا کام

نہ جوتے تھے۔ لہذا انہوں نے خود کشی سے مایوس ہو کر وقت کٹی کے لئے شعر و شاعری کا سہارا لیا اور بے سرو سامانی کے عالم میں معشوق کے بستر کا تصور باندھ لیا۔

ناز شہزادیام خاکستر نشینی کیا کہوں پہلوئے اندیشہ وقف بستر سنبھال تھا
اس تصوف سے طبیعت قدم سے علی ہوئی تو خاک نشینی ترک کی اپنے بستر کی طرف رجوع کیا
لیکن بستر پر دراز جوتے ہی حالت پھر غیر ہو گئی۔ محبوب کی بے وفائی و عدم خلائی اور عہد شکنی
سب کچھ بھر پورا دئے لگا۔ اس کش مکش اور اضطراب میں دھیمان اپنے ہمد و مہلاز مولیٰ تنہائی
بستر کی طرف منتقل ہوا جیسے وہ اپنے بستر کے لئے بوجہ ثابت ہو رہے ہیں اور دوسرے ٹکٹے اور جہد
سے بستر کو نکال رہا ہے چنانچہ بستر سے فوراً ہمدردی کا احساس پیدا ہونے لگا۔

تمش سے میری وقف کش کش ہوتا رہتا ہے مراسو کچا بالیں ہے مراقب باہر بستر ہے
بر صوفان گاہ بچھڑا اضطراب شام تنہائی! شاعرا آفتاب سحر عیشہ تار بستر ہے
یہ اشعار نہیں بلکہ ایک دستاویز ہے جس سے یہ واضح کرنا مقصود ہے اور ثابت بھی ہوتا ہے

کہ غائب جہاں خریف النفس حساس طبع ہیں اور اپنے بستر تک سے والہانہ عشق و محبت رکھتے
ہیں گویا غائب کا جسم پانی گرم کرنے کی ایک کڑک راڈ ہے جو درمیں جہرا بدوں بجلیاں بھیجی ہوئی
ہیں جن کی تاثیر سے پوشیدہ اس بستر میں ہیں آتش کدے ہزار اس لئے غائب کا بستر کوئی
معمول بستر نہیں بلکہ اپنی ذات و خواص میں لاثانی ہے۔ جسے خراب حقیقت پیش کرنے کے بعد
خون کے آنسو بہانا جائز ہو گا واجب ہو جاتا ہے اور بڑی مایوسی کے عالم میں یہ محسوس ہوتا ہے
کہ میرے خون میں آنکھ صحرائے مئے باعث رونق ہیں۔ لیکن بھیا کروں میرا ہے جس و حرکت
دل بستر پر دراز ہے۔ چنانچہ اس حقیقت حال کا اظہار اس انداز سے کرتے ہیں کہ رقیب
رو میا و بھی اتاری کا لوبا ماننے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

سر شگ سر صحر اولو نور العین واسن ہے دل ہے دست پافتہ۔ بخود مدار بستر ہے
اس حال کو بستر کا بخود مدار قرار دینا جیسے صوفی نے عرش الہی کہا، غائب کا یہ کہنا ہے۔

اس وقت غائب کے دل پر اتنا سے شفقت کا دورہ ہے۔ ورنہ جب وہ اس نابالغ کی نا اہلیوں سے ایسے ہی تنگ آجاتا ہے جیسے ایک پرمیزگر باپ اپنے باغداد اور بد قماش لڑکے کی حرکتوں سے تو بھر جھج اٹھتا ہے۔

میں اور اک آفت کا ٹکڑا یہ دل وحشی کہے عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آسنا :
انجی حیرانہ کی بے چینی لاحق ہے اور بے قرار دل ماجی بے آب کی طرح مجھ کے وصال کے لئے تڑپ رہا ہے تو جیسے بیمار لڑکے کا باپ لڑکے کا حال ڈاکٹر سے بیان کرتا ہے آپ فرمائیے میرے کموں کیا دل کی کیا حالت ہے بھر پادیں غائب کہ بے تابی سے جہاں تیرا بستر خالی ہے
آخر غائب دل برداشتہ اور قد سے ڈھلے یقین بوجھتے ہیں۔ کیونکہ ان کا بستر محبوب کے بغیر کونوں کی نیچا بن جاتا ہے۔ بالآخر کافی سوچ بچا کے بعد وصال کے لئے ہی نسخہ کیا تجویز کرتے ہیں کہ ہسپتال میں داخل ہو جائیں۔ یعنی دہان سے راہ درم بڑھا کر مجھ کے در پر ہی چاٹیں۔
پھر کئی عرصے کا درپیکر کے ٹپے رہیں۔ صومیر پر بار منت و دہاں کٹے ہوئے

ان کی یہ تدریس ایک حد تک گارنٹنٹ ہوتی ہے اور وہ بالآخر دہان کو شیشے میں میں اتار بیٹے میں کامیاب ہو کر خاکِ رے کا بستر بنا کر دو محبوب پر دھونی ملاتے ہیں۔ لیکن ہر وقت یہی خدشہ رہتا ہے کہ کسی وقت پاسباں کو چہرہ پر رکھنے کا نادبی حکم جاری نہ کرے۔
یا وایتے کرد کو پیشِ نریم پاسباں بستر او خاکِ رے و ہائش ز بستر و استم

غائب کے محبوب کا دہان کو قی خانہ دانی اور خدا ترس انسان معصوم ہوتا ہے۔ جس نے غائب کو کھنچوٹ دے دی تھی۔ البتہ محبوب کو جب دہان کی اس کارستانی کا علم ہوا کہ غائب اس کی شر پر خاکِ رے کا بستر بنا کر کو چر میں ڈٹا۔ خواہے تو اس نے دہان کو چھٹی دے دی۔ چنانچہ غائب کا ہمدرد چلا گیا تو اسے اللہ خدائے کس پر مٹی کے عالم میں کو چر محبوب سے گھر لوٹ آئے۔ جس بھر بار میں ان بہت اور کمزوری بڑھ کر عام نزع طاری ہو گیا چنانچہ اسی عالم میں بڑے وقتے محبوب کو خدا کا واسطہ دے کر آخری دنیا کے لئے بلاتے ہیں۔

اسے نزع میں چل بے وفا برتے خدا مقام ترکِ محاب و دواج تکمیل ہے :

رہا مستجاب ہوئی محبوب کو مستحضر ذائق سے غائب کی حالت نزع کاظم ہوا تو پہلے خط لکھا۔ لیکن پھر
 خدا کی لپٹ پہلک کے شدید صرار پر بنفس نفیس تیار داری کے لئے چل پڑا۔ جو نئی غائبے محبوب کو
 غریب نہ ذائق محنتی ملاں میں کوئی افزودہ ہوتے دیکھا تو اس کا دل تھیں پھٹنے لگا۔ اگرچہ اب افتاد
 ہو چکا تھا۔ لیکن محبوب کو آدیکہ کر پھر تہ سے پر نقاہت طرہ کی گئی اور بیدار کر بیٹ گیا۔ محبوب
 شکر یہ ادا کیا۔ مگر اپنی نظرت سے مجبور ہو کر طنز پھر بھی نہ چھوڑی۔ وہ محبوب کے آنے کا احسان محبوب پر نہیں
 بلکہ اپنی بیماری پر رکھ کر یہ خود ستائی غائب کے کسی حال میں نہ چھوڑی اس لئے زندگی ایسے بُرے حوالہ گئی۔
 خفا اقبال در بخوری عیادت کو تم آئے ہو فردیہ شمع با میں طالع بیدار بستر ہے !

لیکن محبوب بھی غائب کا محبوب کے سرور کن فہم ہو گا۔ اس لئے جب اس نے شکیلی نظروں سے دیکھا
 یمن گویا زبان حال سے یہ کہہ کر غائب ہم تو مل کر اپنی مرضی سے آتے اور تم داد اپنی بیماری کو دے رہے ہو
 تو پھر غائب سنبھلے اور نگے خوش آمد کرنے کے اسے جان غائب میں تمہارا اس قدر احسان مند ہوں کہ اس
 آخری وقت سرانے پہنچ کر جو بے کس نوازی فرمائی ہے۔ اس کے صلے میں عمر بزرگ کے بقایا دوا ایک
 لمحے بھی حضور کے قدموں پر نچاؤ کرنا چاہتا ہوں۔

بیالیم رسیدستی زہے ہے کس نوازی با ! ذرات یک دو دم فکر گرا می دار سیدن ہم
 آخر محبوب دھخت ہوا۔ جاتے ہوئے جھک کر غائب کو غور سے دیکھا کہ واقعی بیمار ہے یا مکر
 بناتے رہے تو نہ نفس نکلتے سے مکران میں اندر اپنی غرضیں کئے پر چھوڑ گئیں شاید کوئی تیر قسم کا سینٹ ہو گا
 جو آج سے اس کی نوسین سپور کا شام کو آت ڈیوٹی ہو کر گاتی تھیں ہر حال طبیعت حاضر قی ہو۔ فریاد

ابھی آتی ہے تو با ش سے اس کی ذلت شکیں کی ہلکی دیکھ کو خواب زینما عمار بستر ہے
 ابھی ان خیالات میں محو تھے کہ در پر محبوب کا خط آیا جسے آنکھوں سے لگا کر کئی بار چومنا اپنی خوش فہمی
 پر انداز ہوئے کہ آج پھر پھر ڈر کر مہربانی ہو گئی ہے غرض خط ہاتھ میں لے کر بستر پر بیٹھ جیسے ذرا سیانا
 شیر خوار اپنی دودھ کی بوتل افیہ خود ہی ہاتھوں میں لیکر بیٹھ جاتا ہے اور دودھ پیتا ہے خط کھولا
 اور پڑھا اور اس کے بعد یہ واقعہ اخباروں کی خبر کا عنوان بن گیا کہ بارش قبل ہو گیا کیونکہ پوس
 کی شہادت میں یہ شعر غائب کی چھائی پر خط کے ساتھ ملا ہے

ایک کتاب جو بچے کے ہے

سلاویٹر شہر

ملکت پاکستان لوزالہدہ ریاست ہونے کے باوجود اپنی
"الوادئ قوت" کی بنا پر ساری دنیا میں ایک خصوصی
شہرت حاصل کر چکی ہے ۔

جہاں دنیا بھر کے عوام سیاحت کی غرض سے ہمارے ہاں
آتے ہیں ۔ ویسے ہی ہمارے تربیت یافتہ لوگ حصول علم ، تفریح
رلزگار ، تجارت ، اور سیاحت کی غرض سے آئے دن بیرون
ممالک کا رخ کر رہے ہیں ۔ میں وجہ ہے کہ ہر وقت وہ دنیا
کے مشہور اور بڑے بڑے شہروں کے حالات جاننے کے
متلاشی رہتے ہیں ، اتفاق سے ہمارے ہاں آج تک اس موضوع پر
کوئی کتاب شائع نہیں ہو سکی ۔

اس حلاء کو پُر کرنے کے لئے مکتبہ میری لائبریری نے
پہل بار اس موضوع پر اردو میں ایک معیاری اور دلکش کتاب
شائع کرنے کا اعزاز حاصل کیا ہے چونکہ یہ کتاب پاکستان
میں طبع ہو رہی ہے اس لئے پاکستان کے چند مشہور شہر
بھی اس میں شامل کر دیئے گئے ہیں ۔ جنہیں بین الاقوامی
طواری بھی کسی نہ کسی وجہ سے شہرت حاصل ہے ۔

زندگی اور عمل

مصنف : ڈاکٹر مارٹن

اس وسیع دنیا میں تقریباً اڑھائی ارب انسان بستے ہیں لیکن ہر جگہ اور ہر دور کے کتابخانوں کو آپ انگلیوں پر گن سکتے ہیں ۔

آخر ہر شخص کتاب کیوں نہیں پوتا ؟

اس کی صرف ایک وجہ ہے کہ ہر شخص کو زائد رہنے کا ڈھنگ نہیں آتا ۔ زائد رہنا بھی ایک فن ہے ۔ زندگی اور عمل ایک ایسی کثافت ہے جو اس فن کی بڑی اچھی مثال ہے ۔ اس میں بڑے دلچسپ انداز میں روزمرہ زندگی کے مسائل کو بہتر طور پر حل کرنے کا راستہ بتایا گیا ہے ۔

یہ کتاب آپ میں خود اعتمادی ، قیام کی خواہش ، خوشی ، لاگوار حالات کا مقابلہ کرنے کی جرأت ، فہم داروں سے عہدہ برآ ہونے کی ہمت ، صحت مندی اور قابلیت پیدا کرے گی ۔

”زندگی اور عمل“ عرصہ چالیس سال سے ایک مفید اور معیاری کتاب کے طور پر پڑھی جا رہی ہے ۔

یہ کتاب زندگی کے ہر سوڑ پر آپ کی رہنمائی ثابت ہوگی ۔

بشیر احمد چرغوری

مکتبہ نیری لائبریری لاہور - ۶



پیراز ہار جیتا ہوئے غالب کے ہارے میں شام نواز رہے
دریاخت کرے کچے بتانا

میری کا ترجمے میں تاریخ و سوانح کی ادبی نگارگری

ابوبکر صدیق اکبر	محمد حسین ریکل	حاج محمد احمد پانڈی
عمر فاروق اعظم	"	"
عثمان غنی	ابوبکر شبلی	عبد الشکور جلی
السادات	عمر ابو انصر	محمد احمد پانڈی
الحسین	"	"
الامیر	"	"
ابوذر غفاری	عبد المجید جتوہ السار	عبد الصمد صادم
امیر معاویہ	انیس زکریا نعولی	"
امام زہری العاصم	عبد العزیز مہدالی	"
راشد بصری	دعاد اسکاکینی	"
عمر بن عبد العزیز	احمد زکریا	"
انسانیس بڑے آدمی	ذیل کاریگی	جابر شاہین
انیس نہ انیس	"	"
عبد اللہ بن عمر	سلام اللہ صدیق	"
تقریباً	آبظریگی	ناظر حسین زیدی
سلطانی مملوک کے راز	جمال پاشا انقزی	عبد الرزاق بیچ آبادی
شیخ عبد القادر جیلانی	حکیم نظام حیدر جیل	"
نور شاہ کمال گنجی	خوشید حسین بخاری	"
سید سے سدا	محمد ساجیل پانڈی	"

ولی

تحقیق و تنقیدی مطالعہ

اپنی ساری اولیت کے باوجود ولی ہمارے تعلیم یافتہ طبقے کے لئے ایک اجنبی کی حیثیت رکھتا ہے لیکن ادب اردو کے طالب علموں کے لئے وہ ابتدا ہی سے موضوع دلچسپی رہا ہے ، اردو کے مستند نقادوں نے اس کی حیات و فن کے مختلف زاویوں کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے ۔ اس کی زندگی ایک طویل مدت تک ادبی رسائل میں نقادوں اور محققین کے درمیان موضوع بحث رہے ہیں اور ان پر خوب داد تحقیقی دی گئی ہے ۔ اسی طرح کئی نقادوں نے اس کے فن اور شاعری کے مختلف زاویوں کا مختلف مضامین میں جائزہ لیا ہے ، ان میں بیشتر مضامین پرانے رسائل کی فائلوں میں بدقوت ہیں اور عام قاری کی ان تک پہنچ نہیں ممکن ہے ۔ ولی پر لکھے گئے کل تحقیقی و تنقیدی مضامین کا جائزہ لینے کے بعد ایسے مضامین کا انتخاب کیا گیا ہے جو ”بہترین“ کے عنوان کے مستحق ہیں اور ان کو اس ترتیب سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ولی کی حیات و فن کی مکمل و جامع تصویر قاری کے سامنے آجائے ۔

مکتبہ میری لاہوری لاہور ۲

